# THE SERMON ON THE MOUNT

*By*

REV. DR. CHARLES GORE

# پہاڑی وعظ

(ایک عملی تشریح)

مصنفہ

پادری ڈاکٹر چارلس گور صاحب

کرسچن نالج سوسائٹی

انارکلی - لاہور

S. P. C. K. LAHORE

1956

Scanned with CamScanner

1.50

Sagar. B. Arif Gill
A.R.P. Church
VEHARI

Rev. Benjamin
A.R.P. Church,
VEHARI

Rev.
Benjamin
A.R.P. Church
Vehari
1/6/1977

Scanned with CamScanner

# پہاڑی وعظ

(ایک عملی تشریح)

مُصنّفہ

## پادری چارلس گور صاحب

ڈی-ڈی+ڈی-سی-ایل+ایل-ایل-ڈی

مترجمہ

## پادری ایس-این-طالب الدین صاحب

بی-اے

کرسچن نالج سوسائٹی

لاہور

سنہ ۱۹۵۶ء

بار دوم

تعداد ۱۰۰۰

Scanned with CamScanner

# فہرستِ مضامین


| | | صفحہ |
|---|---|---|
| باب اوّل — | وعظ۔ | ۵ |
| باب دوم — | مُبارکبادیاں۔ اجمالی بیان | ۱۷ |
| باب سوم — | مُبارکبادیاں۔ تفصیلی بیان | ۲۶ |
| باب چہارم — | پُرانی شریعت کی نظرِثانی | ۵۱ |
| باب پنجم — | پُرانی شریعت کی نظرِثانی (جاری) | ۷۸ |
| باب ششم — | آسمان کی بادشاہت کے باشندوں کا محرّک | ۱۰۱ |
| باب ہفتم — | خُداوند کی دُعا | ۱۱۹ |
| باب ہشتم — | عدم دُنیا داری | ۱۳۹ |
| باب نہم — | مسیحی خاصیّتیں | ۱۵۱ |
| باب دہم — | آخری تنبیہات | ۱۷۲ |
| تتمہ نمبر اوّل — | پہاڑی وعظ | ۱۸۸ |
| تتمہ نمبر دوم — | مسیحیوں کے لئے دس احکام | ۲۰۸ |
| تتمہ نمبر سوم — | طلاق کے متعلّق کلیسیا کا فرض | ۲۲۰ |


Rev. [illegible]nyameen
A.R.P. Church
VEHARI

Scanned with CamScanner

# پہاڑی وعظ

## باب اوّل

### وعظ

#### ۱

پہاڑی وعظ کیا ہے؟ پہاڑی وعظ مسیح کی بادشاہت کا اخلاقی قانون ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہیں کہ عہدِ جدید میں پہاڑی وعظ وہی جگہ رکھتا ہے جو دس احکام کو عہدِ عتیق میں حاصل ہے اور یوں پہاڑی وعظ اس تعلق کی جو خُدا کے دونوں عہدوں یا وعدوں میں پایا جاتا ہے، ایک اعلےٰ مثال پیش کرتا ہے۔ اس مضمون کے متعلق بزرگ آگسٹین کا ایک جملہ ہے جس کا یاد رکھنا ہر ایک کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ وہ فرماتا ہے کہ "اگر ہم اِس امر کا انکار کریں کہ عہدِ جدید کی طرح عہدِ عتیق کا منبع بھی خُدائے نیک و عادل ہے تو ہم اُس کے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں۔ برعکس اِس کے اگر ہم عہدِ عتیق کو عہدِ جدید کے ہم پلہ بنا دیں تو ہم عہدِ جدید کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کرتے ہیں"۔ یہ بات عام طور پر دونوں کے متعلق درست ہے۔ لیکن خاص طور پر اخلاقی قانون کے متعلق عہدِ عتیق کا اخلاقی قانون جو دس احکام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اُسی خُدا کا کلام ہے جو اب

ہم سے مسیح یسوع میں ہو کر بولتا ہے۔ اب وہ دوبارہ پہاڑی وعظ میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن پہلے کی نسبت زیادہ نفیس اور گہرے معانی لئے ہوئے ہے۔ ہم سچائی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پہاڑی وعظ دس احکام پر فائق ہے۔ لیکن اس معنی میں کہ وہ اُنہیں ایک زیادہ وسیع۔ عمیق اور جامع کلیہ میں داخل کر لیتا ہے۔

یہ پہاڑی وعظ نئی بادشاہت کا۔ آسمان کی بادشاہت کا، مسیح کی بادشاہت کا اخلاقی قانون ہے ہم اکثر اوقات مسیح کو تنہا اور غیر متعلق تصوّر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مسیح موعود جس کی آمد کی توقع عہدِ عتیق میں کی جاتی ہے۔ مسیحانہ بادشاہت کا مرکز ہے۔ وُہ اُس کی رُوح رواں ہے۔ اگر بادشاہت بادشاہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، تو بادشاہ بھی بادشاہت پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ خُداوند اپنے مسیح ہونے کی خبر ذیل کے الفاظ میں دیتا ہے۔

"آسمان کی بادشاہت نزدیک ہے"۔

اور بعد میں جب وہ اپنے چند شاگردوں کو بلا چکتا ہے۔ تو اُنہیں علیحدہ لے جاتا ہے اور پہاڑ پر بیٹھ کر اُن نئی بادشاہت کے جس میں اُنہیں داخل ہونا ہے۔ اخلاقی قانون کو اُن کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اُن پر ظاہر کرتا ہے کہ یہ قانون نہ صرف انفرادی ضمیروں سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ تمام تمدّنِ انسانی سے متعلق ہے یہ ایک ایسا قانون ہے کہ جب انسان کی ضمیر انفرادی طور پر اُسے قبول کر لیتی ہے تو تمام جماعت پر اُس کا اطلاق ہوتا ہے تاکہ ایک نیا نظامِ تمدّن رُونما ہو۔ یہ قانون ایک بادشاہت کا قانون

ہے اور بادشاہت ایک ایسا نظام ہے کہ جس میں انسانوں کو مختلف درجوں اور گروہوں میں مرتب کیا جاتا ہے۔ لیکن سب متحدہ طور پر اپنے بادشاہ کے زیر اطاعت زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ یہ جس کا ہم اس جگہ ذکر کر رہے ہیں، قانون ہے۔ شریعت ہے۔ فضل نہیں ہے۔ اور پولوس رسول کے قول کے مطابق وہ محض لفظ ہے۔ روح نہیں ہے۔ اور جب پولوس فرماتا ہے کہ "لفظ مار ڈالتے ہیں۔ مگر روح زندہ کرتی ہے" (۲ کرنتھی ۳: ۶) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خارجی لکھے ہوئے احکام (یعنی الفاظ) محض خدا کی مرضی کو ہم پر ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ الٰہی مرضی کو پورا کرنے کے باب میں ہماری عدم قابلیت کو ہم پر ثابت کر دیتے ہیں اور یوں ہمیں رسوا کرتے اور "مار ڈالتے ہیں"۔ وہ ہماری معصیت اور لاچاری کو تو ہم پر منکشف کر دیتے ہیں، لیکن ہمیں وہ زندگی اور قابلیت عطا نہیں کرتے۔ جس سے ہم خدا کی مرضی کو پورا کر سکیں۔ روح زندگی بخش قدرت ہے لہذا شریعت جو محض آگاہ کرتی ہے مار ڈالتی ہے۔ لیکن روح جو قدرت بخش ہے زندہ کرتی ہے۔ لیکن اس موت میں سے گزرنا ایک نہایت ہی ضروری اور مفید تجربہ ہے اور شریعت کے بغیر زندہ رہنا (رومیوں ۷: ۹)۔ یعنی اس مصنوعی اطمینان میں زندگی بسر کرنا جو جہالت پر مبنی ہے خالی از خطر نہیں ہے۔ کیونکہ "اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی

کیسی بڑی ہوگی"؟ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم معلوم کریں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور جب ہم اپنے اندر اس کے کرنے کی عدم قابلیّت پائیں گے تو ہم تائید ایزدی کے لئے ضرور درخواست کرینگے۔

ایک دفعہ پھر میں آپ کی توجّہ بزرگ آگسٹین کے ایک جُملہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو نہایت ہی پُر معنی معلوم ہوتا ہے "شریعت اس لئے دی گئی کہ انسان فضل کی تلاش کرے۔ اور فضل اس لئے دیا گیا کہ شریعت کی تکمیل ہو"۔

لہذا پہاڑی وعظ شریعت کی انتہائی منزل ہے۔ الفاظ کی تکمیل ہے۔ یعنی اُن الفاظ کی جو مار ڈالتے ہیں۔ اور چونکہ پہاڑی وعظ دس احکام کی نسبت بہت زیادہ کامل اور جانچنے والا ہے۔ اس لئے بہت زیادہ مارنے والا بھی ہے۔ وہ ہمارے اندر گناہ کا زبردست احساس پیدا کرتا ہے اور ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم خُدا سے بزور درخواست کریں کہ وہ ہمیں طاقت عنایت کرے تاکہ ہم اُس کے فرمُودہ پر عمل پیرا ہو سکیں۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ خُدا انسان کی ضرورت کے ذریعے اپنے مقاصد پورے کرتا ہے یا جیسے کہ بعض اعلےٰ درجہ کے ڈراموں میں عین مصیبت کے وقت رہائی اور مخلصی کی تجویز بھی رُونما ہو جاتی ہے اِسی طرح یہاں بھی ہے۔ خُدا اپنے مطالبات کو بڑی وضاحت اور تاکید کے ساتھ ضمیر انسانی پر ظاہر کرتا ہے اور یہ مطالبات محض قوانین کی صورت میں پیش نہیں کیئے جاتے بلکہ (جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا) ایک قابل نمونہ سیرت یا کیریکٹر کی صورت میں۔

یہ مطالبات ایک ایسے خُدا کے مطالبات نہیں ہیں جو پردۂ تاریکی میں مستور ہے اور جس تک رسائی ناممکن ہے بلکہ ایک ایسے خُدا کے مطالبات ہیں جو سرتاپا محبّت ہے اور جو اپنے آپ کو انسان کی صورت میں ظاہر کرتا ہے اور اپنی الٰہی مہر و وفا کی بنا پر وعدہ کرتا ہے کہ جو بھوکا ہے وہ سیر کیا جائے گا اور جو فریاد کرتا ہے، اُس کی سُنی جائے گی۔ اس جگہ الفاظ کے سخت اور نہ بردست تقاضا اور روح کے وعدہ میں ایک نہایت ہی قریبی تعلّق دکھایا گیا ہے۔

۲

اکثر کہا جاتا ہے کہ پہاڑی وعظ میں کئی ایک ایسی باتیں ہیں جو بعض دیگر کتابوں کی تعلیمات سے مشابہت رکھتی ہیں اور اُن کتابوں میں نہ صرف عہدِ عتیق کے صحیفے شامل ہیں۔ بلکہ اُن میں یہودی آباء اور غیر مسیحی فلسفیوں مثل کنفیوشس۔ سقراط اور افلاطون وغیرہ کی تصانیف بھی شمار کی جاتی ہیں اور اس حقیقت نے بعض مسیحیوں کو جو اپنے مذہب کے عدیم المثل جلال کے قائل ہیں بہت بے چین کیا ہے۔ لہذا اُنہوں نے اُن مشابہتوں کی جو "ملہم" اور "غیر ملہم" مصنّفوں اور الٰہی اور انسانی متکلّموں کے کلام میں پائی جاتی ہیں یوں توجیہہ کی ہے کہ غیر مسیحی مصنّفوں نے بھی عہدِ عتیق سے اپنی تعلیمات مستعار لی ہیں۔ لیکن وہ اُس بڑی حقیقت کو جو شروع کی صدیوں میں ہمیشہ مسیحیوں کے پیش نظر رہتی تھی بھول جاتے ہیں۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ مسیح کلمہ ہے اور اُس کلمہ یا عقل الٰہی کے ساتھ رفاقت پیدا کرنے سے تمام انسان اہلِ عقل بن جاتے ہیں۔ مسیح

وہ نُور ہے جو ہر انسان کی عقل و ضمیر کو منوّر کرتا ہے اور تمام نسل انسانی کو مستفید کرتا ہے بلکہ ابتدائے عالم سے وہ اپنی رُوح کے ذریعہ انسان کے شعور میں اپنا کام کر رہا ہے اور انسان کی موجودہ اخلاقی ترقی اور کُل نسل انسانی کی اخلاقی تربیت ایک ہی واحد سلسلہ میں منسلک ہیں۔ ایک ہی رُوح ہے جو شروع سے آخر تک کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک ہی کلام ہے جو سب کو مخاطب کرتا ہے۔ لہذا اُس بڑی حقیقت کے جس کا کامل بیان پہاڑی وعظ میں پایا جاتا ہے کم و بیش حِصص کا چینی۔ جاپانی۔ یونانی یا ہندی کتب دینیہ میں پایا جانا کچھ باعثِ استعجاب نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خُدا نے کسی زمانہ میں بھی اپنے آپ کو بے گواہ نہیں چھوڑا اور یہ گواہی اُس کے کلام اور رُوح کی گواہی ہے جو اِنسان کے دل میں پائی جاتی ہے[1]۔

لیکن ساتھ ہی اس کے ہم کو اِس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ اخلاقی قانون جو پہاڑی وعظ میں دیا جاتا ہے۔ اُس اخلاقی قانون سے جو غیر اقوامی مذاہب یا فلسفہ بلکہ یہودی مذہب میں پایا جاتا ہے، اعلیٰ اور افضل ہے اور وہ ان سب کو ایک وسیع تر کلیہ میں شامل کر لیتا ہے۔ ہم ذیل کی مختلف صورتوں میں پہاڑی وعظ کی اخلاقی تعلیم کا دیگر مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ پہاڑی وعظ کی تعلیم اِنسان کے اخلاقی فرائض کے متعلق جامع اور کامل ہے۔ برعکس اس کے دیگر مذاہب کی اخلاقی تعلیم غیر مکمّل

---

[1] دیکھو یُوحنّا ۱: ۴-۱۲ + رومیوں ۲: ۱۴-۱۶ + اعمال ۱۷: ۲۲-۳۱۔

اور ادھوری ہے۔ اخلاقی تعلیمات کا کوئی سلسلہ ایسا نہیں ہے جو گہرائی اور کاملیت کے اعتبار سے پہاڑی وعظ کا مقابلہ کر سکے۔ کوئی ایسا قدیمی یا مسلمہ مذہب نہیں ہے جس کے متعلق یورپ کا کوئی تعلیم یافتہ فرد یہ دعوے کر سکے کہ وہ کامل ہے۔ جان سٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) جو اہلِ ایمان میں سے نہ تھا ہمارے خداوند کی اخلاقی تعلیم کے متعلق یوں کہتا ہے "اتنی صدیوں کے گزر جانے کے بعد بھی نیکی کے قانون کو عملی جامہ پہنانے کا اس سے بہتر طریقہ کسی ملحد کو بھی نظر نہیں آتا کہ انسان ایسی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے جو یسوع مسیح کو پسند آئے اور ڈاکٹر پُسے (PUSEY) صاحب اس پر یوں اضافہ کرتے ہیں "اگر انسان مسیح کی تعلیم کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے تو ملحدوں کی تعداد بہت کم ہو جائے"[1] چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسیحی مذہب کے علاوہ کسی اور قدیمی مذہب کے مجموعۂ اخلاقی تعلیمات کے متعلق زمانۂ حاضرہ کا کوئی تعلیم یافتہ شخص یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اس کے اصول ایسے جامع اور کامل ہیں کہ کبھی بھی ناقص یا انسانی ضروریات کے لئے ناکافی ثابت نہ ہوں۔ پہاڑی وعظ باعتبار اپنی اخلاقی تعلیم کے کامل ہے اور دیگر تعلیمات ناکامل ہیں۔

---

[1] دیکھو مل (MILL) صاحب کے تین جواب مضمون متعلق تعلیم خدا (THREE ESSAYS ON THE ISM۔ صفحہ ۲۵۵۔ PUSEY صاحب کے یونیورسٹی سرمن ۱۸۶۴ سے ۷۲ تک۔ "خدا اور انسانی آزادی" صفحہ ۱۰۔ نوٹ ۱۔

۲۔ پہاڑی وعظ کی تعلیم خالص ہے اور دیگر تعلیمات میں آمیزش اور نقص پایا جاتا ہے۔ بزرگ اوزبن بارھویں زبور کے ذیل کے الفاظ کی تفسیر کرتا ہوا غیر اقوامی مذاہب کی کتب مقدسہ کا مسیحی کتابوں سے مقابلہ کرتا ہے۔

"خداوند کا کلام پاک ہے۔ اُس چاندی کی مانند جو بھٹی میں مٹی پر تائی گئی اور سات بار صاف کی گئی ہو" اور یوں کہتا ہے "گو غیر مسیحی کتابوں میں بھی اعلےٰ اور ارفع باتیں پائی جاتی ہیں لیکن وہ خالص نہیں ہیں۔ کیونکہ اُن میں ناراستی کی آمیزش پائی جاتی ہے" مثال کے طور پر افلاطون کی تحریرات لے لیجئے اُن میں بہت سی باتیں نہایت ہی بلند پایہ ہیں بالخصوص وُہ جو خدا کی محبت کے بارے میں ہیں۔ لیکن اُن کے پہلو بہ پہلو بہت سی ادنےٰ اور گری ہوئی باتیں بھی نظر آتی ہیں جو اس وقت کی یونانی زندگی کی قبیح اور گھنونی رسمیات سے متعلق ہیں اور جن سے مُصنّف کو ہمدردی اور موافقت ہے۔ یہی بات بُدھ مت کی کُتب مقدسہ میں دکھائی دیتی ہے۔ لہذا پہاڑی وعظ اور دیگر اخلاقی تعلیمات میں وہی نسبت اور تعلق ہے۔ جو ایک خالص چیز میں اور آمیزش اور نقص والی چیز میں پایا جاتا ہے۔

۳۔ پہاڑی وعظ کی تعلیم ایسی تعلیم ہے جو بالغوں اور آزاد لوگوں کو دی جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں غیر مسیحی مذاہب کی اخلاقی تعلیم ایسی ہے جو بچّوں اور غلاموں کو دی جاتی ہے۔ مسیح کی تعلیم اوامر و نواہی کی صورت میں نہیں ہے۔ بلکہ ایسے اصولوں کی صورت میں جو وزنی اور گراں قدر ہیں اور جو اندرونی اور روحانی شعور کی مدد سے

سمجھ میں آتے ہیں اور ہر زمانہ میں اُن کا نیا اطلاق ہوتا رہتا ہے۔

۴۔ پہاڑی وعظ اور دیگر اخلاقی تعلیمات میں آخری فرق یہ ہے کہ پہاڑی وعظ کے الفاظ ایک صاحبِ اختیار اور عجیب و غریب ہستی کی زبان سے نکلتے ہیں اور اُس کی شخصیت اُنہیں مستند اور قابلِ تسلیم بنا دیتی ہے۔ "وہ فقیہوں کی طرح نہیں، بلکہ صاحبِ اختیار کی طرح تعلیم دیتا تھا۔" اُس کی پُر اسرار شخصیت کا زور۔ اُس کی الٰہی ہستی کا رُعب۔ اُس کا دبدبہ۔ اُس کا اختیار۔ اُس کے کلام میں زور اور قائل کرنے کی طاقت پیدا کرتا تھا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ لوگ خوف کی وجہ سے اُس کا کلام سُنتے تھے۔ بلکہ اُس کی شخصیت سُننے والوں کے دلوں میں خود بہ خود یقین پیدا کر دیتی تھی کہ اُس کے دعاوی بے بنیاد نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اُن کو پورا کرنے کی قدرت بھی عطا کرتا ہے۔

## ۳

مَیں اس جگہ اختصار کے ساتھ ایک اہم مسئلہ کا ذکر کیا چاہتا ہُوں جو ہمیشہ اناجیل کے محقّقین اور نکتہ چین اصحاب کے پیشِ نظر رہتا ہے اور وہ اناجیل کے باہمی تعلّقات کا مسئلہ ہے اور چونکہ اُس کا ہمارے مبحث سے بھی تعلّق ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم اُس کا کچھ نہ کچھ بیان کریں۔ لیکن جگہ کی قلّت کی وجہ سے بیان مفصّل اور خاطر خواہ نہ ہوگا۔

پہاڑی وعظ جو متّی کی انجیل میں مرقوم ہے متعدد اختلافات کے باوجود عنقریب وہی ہے جو لُوقا کی انجیل میں کئی ایک ابواب میں پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل یُوں ہے۔ ۶: ۲۰ - ۴۹ + ۱۱: ۱ - ۴ و

۹-۱۳ و ۳۳-۳۶ + ۱۲: ۲۲-۳۱ و ۵۸-۵۹ + ۱۳: ۲۴-۲۷
۱۴: ۳۴-۳۵ + ۱۰، ۱۰: ۱۲ و ۱۷-۱۸[ل] - اب سوال پیدا ہوتا ہے
کہ یہ تعلق جو ایک ہی تعلیم کے دو مختلف بیانات میں پایا جاتا ہے
کس قسم کا ہے - کئی ایک باتیں متّی کے بیان سے ایسی مختص ہیں، جو لُوقا
کے بیان میں بالکل غیر موجود ہیں - مثلاً دس احکام - دُعا - خیرات اور
روزہ کے دینی فرائض کی روحانی توضیح و تفسیر - لیکن جہاں دونو انجیل نویس
مشترکہ باتوں پر بحث کرتے ہیں - وہاں اُن کے بیانات میں اس قدر
مشابہت نظر آتی ہے کہ اُن کا ایک ہی ماخذ معلوم ہوتا ہے - لیکن
ہم اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ ماخذ تحریری تھا یا زبانی
اس بات پر غور کیا چاہتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کو دو مختلف
طریقوں پر کیوں پیش کیا جاتا ہے -

متّی کے طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے واقعات اور
اقوال کو جو ایک دوسرے سے مشابہ نظر آتے ہیں - ایک ہی جگہ جمع
کر لیتا ہے - مثلاً وہ معجزات کا ایک مجموعہ پیش کرتا ہے (ابواب ۸ و ۹)
سات تمثیلوں کو یک جا رقم کرتا ہے (باب ۸) فریسیوں کی ریاکاری
کو طشت از بام کرتا ہے - اس بات کا بیان لُوقا اپنی انجیل کے دو
مختلف حصّوں میں کرتا ہے (باب ۲۳) اور پھر آخری زمانے کے
بارے میں متعدد نصیحتوں کا ایک مجموعہ پیش کیا جاتا ہے (باب
۲۴) لہٰذا متّی کے عام طرزِ تحریر کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے

---

ل پہاڑی وعظ تتمہ نمبر ا میں معہ چاروں اناجیل کی عبارتوں کے مفصل درج ہے
دیکھو صفحہ ۲۰۲ اور بعد کے صفحات -

پہاڑی وعظ میں ان تمام مختلف اقوال کو یک جا جمع کرتا ہے جو حقیقت میں اور جیسا لوقا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے مختلف مواقع پر کہے گئے۔ برعکس اس کے لوقا کا معمول ہمیشہ یہ نظر آتا ہے کہ تمام واقعات اور مسیح کے مختلف اقوال ترتیب کے ساتھ بیان کئے جائیں۔

لیکن اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ اُستاد جو ہمارے خُداوند کی طرح تمثیلوں اور ضرب المثلوں میں تعلیم دیتا ہے وہ ضرور ایک حقیقت کو مختلف طریقوں اور مختلف نکتہ ہائے نگاہ سے پیش کرتا ہے اور اپنے بیان میں اعادہ کرتا ہے۔ وہ جنہوں نے فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) صاحب کی مطبوعہ تحریرات اور نسخہ جات کا مطالعہ کیا ہے بتلاتے ہیں کہ اس کے وزن دار جملے بار بار دُہرائے جاتے ہیں اور ذرا ذرا سے اختلاف کے ساتھ متواتر آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا خُداوند ہم معنی اور ہم شکل اقوال کو بار بار استعمال کیا کرتا تھا۔

لہٰذا اگر مقدّس لوقا کا یہ بیان درست ہے کہ ایک موقع پر ہمارے خُداوند نے اُس غُربت اور ایذا کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن کے درمیان شاگرد زندگی بسر کر رہے تھے۔ چند مختصر مگر پُر زور مُبارکبادیوں کے ذریعہ اُنہیں دلاسا دیا اور کہا "مبارک ہو تم جو غریب ہو۔ مبارک جو تم جو اب بھوکے ہو۔ مُبارک ہو تم جو اب روتے ہو۔ جب لوگ تم سے عداوت رکھیں گے تو تم مبارک ہو گے"۔ تو اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُس نے کسی اور موقعہ پر متّی کے بیان

کے مطابق اسی قسم کی اور مبارکبادیاں نہیں سُنائیں جو شمار میں زیادہ تھیں اور عام اور رُوحانیت کے اعتبار سے زیادہ گراں پایہ تھیں اور جن میں سے سب روپیہ پیسہ کی غریبی کے متعلق نہ تھیں بلکہ دل کی غریبی کے متعلق تھیں۔ ایک[1] اور موقع پر خُداوند اپنے اس قول کو کہ دولتمندوں کا خُدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیسا مشکل ہے۔ زیادہ روحانی صورت میں یوں بیان فرماتا ہے۔ "جو لوگ دولت پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے خُدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیا ہی مشکل ہے"۔ اُسی طرح یہ امر کہ وہ رّبانی دعا جو لُوقا کی انجیل میں پائی جاتی ہے۔ مختصر ہے۔ اس پر دلالت نہیں کر سکتا۔ کہ خُداوند نے اُسے طویل صورت میں پیش نہیں کیا۔ جیسا کہ متّی کی انجیل میں مرقوم ہے۔

ہمارے خُداوند کی تمام تقاریر کو یکجا متحد کرنا جو کہ انجیل اوّل کی امتیازی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً متّی رسول سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نہ صرف ایک اعلےٰ درجہ کے گواہ کا کام تھا بلکہ ایک ایسے شخص کا جس کی قوّتِ حافظہ ایک تو پہلے ہی سے زبردست تھی اور پھر خُدا کی رُوح نے خاص طور پر اُس کی امداد کی۔ جیسا کہ لکھا ہے کہ .... "رُوح القدُس ... تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ مَیں نے تُم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا"۔ (یُوحنا ۱۴: ۲۶)

---

[1] مرقس ۱۰: ۲۳ تا ۲۴۔ یہ الفاظ متن کے ہیں نہ کہ حاشیہ کے۔

# باب دوم

## مُبارکبادیاں۔ اجمالی بیان

وہ اس ڈھیر کو دیکھ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور جب بیٹھ گیا تو اُس کے شاگرد اُس کے پاس آئے اور وہ اپنی زبان کھول کر اُنہیں یوں تعلیم دینے لگا۔

مُبارک ہیں وہ لوگ جو دل کے غریب ہیں۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہی اُن ہی کی ہے۔

مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں۔ کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں۔ کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں۔ کیونکہ وہ آسودہ ہونگے۔

مُبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں۔ کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔

مُبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کیونکہ وہ خُدا کو دیکھیں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں۔ کیونکہ وہ خُدا کے بیٹے کہلائیں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُنہیں کی ہے۔ جب میرے سبب لوگ تمہیں لعن طعن کریں گے اور ستائیں گے اور ہر طرح کی بُری باتیں تمہاری نسبت ناحق کہیں گے۔ تو تم مُبارک ہو گے۔ خوشی کرنا اور نہایت شادمان ہونا۔ کیونکہ آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ اس لئے کہ لوگوں نے اُن نبیوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے اسی طرح ستایا تھا۔

ہمارا خُداوند بھیڑ سے بچنے کی غرض سے پہاڑ پر چلا جاتا ہے۔ اور اُس کے چیدہ شاگرد اُس کے پاس آ جاتے ہیں۔ اور یہ وعظ اُن کو سنایا جاتا ہے۔ یہ وعظ دنیا کے لئے نہیں بلکہ کلیسیا کے لئے تھا لیکن بھیڑ نے بھی اُسے سُنا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت وہ کلیسیا کے گوش گذار کیا گیا۔ لیکن عام دنیا بھی اس سے فیضیاب ہوئی۔

۱۔ وعظ اُن مُبارک بادیوں سے شروع ہوتا ہے۔ جن سے ہمارے کان خوب مانوس ہو چکے ہیں۔ یہ نئی مُبارک بادیاں۔ نئی بادشاہت کے باشندوں کی سیرت کو بیان کرتی ہیں۔ یعنی اُس شخص کی سیرت کا بیان جو خُدا کی بادشاہت کی آزادی سے مستفید ہوتا ہُوا حقیقی مُبارک حالی کی وراثت کو حاصل کرتا ہے۔ اس جگہ خاص بات جو قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی سیرت کی تصویر ہے نہ کہ اعمال کی مسیح ہم سے خاص خاص اعمال کی توقع نہیں کرتا۔ بلکہ ایک خاص رعیت کی سیرت طلب کرتا ہے۔ اور یہ سیرت درحقیقت ہمارے خُداوند کی اپنی سیرت ہے۔ جو الفاظ کے لباس میں پیش کی جاتی ہے۔ اور یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے۔ کہ ہمارے خُداوند کی اِنسانی سیرت ہمیشہ کامل اور عین اُس کی اپنی تعلیم کے مطابق نظر آتی ہے۔ ذیل میں ہم دو دلائل پیش کرتے ہیں۔ جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ہمارے خُداوند کی تعلیم عالمگیر اور انفرادی اطلاق رکھتی ہے۔

یہ کہ اُس کی تعلیم میں تفصیلی احکام نہیں ہیں بلکہ ایک سیرت ہے۔ جس میں ایسے اصول ہیں جو ہر قسم کے حالات کے درمیان قابلِ فہم و عمل ہیں

(۲) یہ کہ مسیح کی تعلیم نہ صرف لفظی تعلیم ہے۔ بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو ایک زندگی ہے جو اس کی بہترین تائید و تفسیر ہے۔

اور یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق ہماری سیرتوں کا اندازہ لگایا جائے گا۔ خداوند کا ذکر کرتے ہوئے پولوس کہتا ہے کہ "وہ راستی سے دنیا کی عدالت اُس آدمی کی معرفت کرے گا۔ جسے اُس نے مقرر کیا ہے۔" اعمال ۱۷: ۳۱)۔ اسی طرح یوحنا بھی فرماتا ہے کہ "ہم اُس کی مانند ہوں گے۔ کیونکہ اُس کو ویسا ہی دیکھیں گے۔ جیسا وہ ہے۔" (۱۔یوحنا ۳: ۲-۳) خدا کے پاس ہماری سیرت کا اندازہ لگانے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ ہم کس درجہ تک مسیح کی سیرت سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یا پیدا کرتے جاتے ہیں۔ آگے چل کر اس کا مزید بیان ہوگا۔

۲۔ مبارکبادیاں مسیحی کی زندگی کی مبارک حالی کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہیں کہ نئی بادشاہت کا باشندہ وہ ہے۔ جو مریم کے ہمنوا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ "ہر زمانہ کے لوگ مجھ کو مبارک کہینگے۔"

مبارک زندگی کا تصور ہمیشہ اہل دنیا کے پیش نظر رہا ہے۔ پیشتر اس سے کہ کوئی شخص زندہ کہلا سکے۔ ضرور ہے کہ اس کی زندگی میں چند شرائط پوری ہوں۔ وہ زندگی کونسی ہے جو قابل تحصیل ہے؟ اہل غور و فکر ہمیشہ اس سوال کا جواب دریافت کر رہے ہیں۔ گوتم بدھ اور کنفیوشس۔ افلاطون اور ارسطو اسی تلاش میں سرگرداں رہے۔ وہ کون سے عناصر ہیں جو زندگی کو مبارک بنا دیتے ہیں؟ وہ کونسی زندگی ہے۔ جس کی تحصیل پر آپ کسی شخص کو صدق دلی اور گرمجوشی

کے ساتھ ہدیۂ تہنیت پیش کر سکتے ہیں۔

اب اُن جوابات کے تفاوت کا ملاحظہ کیجئے۔ جو دنیا کے بڑے بڑے ہادیوں نے دیئے ہیں۔ گوتم بُدھ کے نزدیک نہ صرف نفس پرستی بُری ہے۔ بلکہ خود نفس ایک نہایت ہی معیوب چیز ہے۔ یعنی مایا ہے اور موجب رنج والم ہے۔ حقیقی اطمینان اور مُبارک حالی ہر قسم کی خواہش کو دُور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ خود زندگی کی خواہش اور چاہت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ اور آخر میں زندگی اور شخصیّت کو بھی خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ لہٰذا گوتم بُدھ کی اخلاقی تعلیم میں بہت سی ایسی قابل قدر باتیں پائی جاتی ہیں۔ جو ہمارے خُداوند کی تعلیم سے مشابہت رکھتی ہیں۔ لیکن اس میں اور مسیح کی تعلیم میں یہ اساسی فرق ہے کہ جس حال کہ بُدھ شخصی زندگی کے وجود کو مایا اور بدی بتلاتا ہے اور اُس سے مخلصی حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ مسیح اُسے اتم درجہ کی حقیقت اور خوبی تصوّر کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے۔ جو خُدا کی حضوری اور رفاقت میں کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ "میں اس لئے آیا کہ وہ زندگی پائیں اور کثرت سے پائیں"۔

اسی طرح ارسطو نے بھی یہی سوال پیش کیا۔ مُبارک زندگی کیا ہے؟ اور وہ اس نتیجہ تک پہنچا کہ مُبارک زندگی صرف محدودے چند کے لئے ممکن ہے۔ غلاموں کا اس میں کچھ حصّہ نہیں۔ کیونکہ وہ دوسروں کے ہاتھ میں محض ہتھیار کے طور پر ہیں۔ بیماروں کو اس سے سروکار نہیں۔ کیونکہ مرض اور رنج لازم ملزوم ہیں۔ غریب بھی

اس سے محروم ہیں۔ کیونکہ تہیدست ہیں وہ جوانی میں مر جاتے ہیں۔ وہ بھی اس سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انہیں ان کی تحصیل کی مہلت نہیں ملتی۔ مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مسیح کی تعلیم اور دیگر تعلیمات میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ مسیح کے فرمان کے مطابق یہ زندگی ہر خاص و عام کے لئے ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ مسیح انسان کو خدا تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ خدا کو انسانی زندگی کا مرکز بناتا ہے۔ خدا کو اس کی بنیاد قرار دیتا ہے اور خدا ہی کو انسان کی زندگی کی منزلِ مقصود مقرر کرتا ہے اور نتیجۃً انسان کی زندگی کو ایک ابدی زندگی قرار دیتا ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی یہ کہ انسان کی زندگی خدا پر مبنی ہے اور کہ وہ ایک ابدی زندگی ہے۔ تو وہ تمام حد بندیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ جن کی بنا پر ارسطو کو کہنا پڑتا ہے کہ غلام۔ بیمار۔ غریب اور وہ جو جوانی میں مر جاتے ہیں۔ اس مبارک زندگی سے خارج ہیں۔ ہمارا خداوند فرماتا ہے کہ یہ مبارک حالی ہر ایک شخص کو بحیثیت انسان نصیب ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس حقیقی رشتہ کو جو اس میں اور خدا میں ہے۔ پہچان لے۔ اس نکتۂ خیال سے وہ تمام حالات جو ہماری پیدائش و تومیّت۔ رنگ و تہذیب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حالاتِ زندگی ہر انفرادی زندگی کو ایک خصوصی رنگ دیتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقی مبارک حالی میں مخل نہیں ہو سکتے۔

ہم اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اگر آپ

مُبارکبادیوں کے آخری حصّوں کا مطالعہ کریں تو آپ اس مُبارک زندگی کا زیادہ مفصّل بیان پائیں گے۔ ہر ایک مُبارکبادی کا آخری حصّہ ہمیں بتاتا ہے کہ خُداوند کا مفہوم مُبارک حالی سے کیا ہے۔ آسمان کی بادشاہت اُنہیں کی ہے۔ وُہ تسلّی پائیں گے۔ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔ وہ آسودہ ہوں گے۔ اُن پر رحم کیا جائے گا۔ وہ خُدا کو دیکھیں گے۔ وہ خُدا کے بیٹے کہلائیں گے۔ ان سات جملوں میں سے آخری چھ درحقیقت سب سے پہلے جملہ کی تفسیر ہیں، کیونکہ وہ سب آسمان کی بادشاہت کی شراکت کے متعلّق ہیں اور وہ شراکت ایک زندگی ہے۔ جس میں انسان اور فطرت کے ساتھ کامل رفاقت اور موافقت ہوتی ہے۔ اور یہ خُدا کے ساتھ رفاقت رکھنے کا ایک نتیجہ ہے۔ یہی حقیقی مُبارک حالی ہے اور یہ سب کے لئے ممکن ہے۔ اس میں تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد تسلّی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ہر انسان اپنے آپ کو وارث سمجھتا ہُوا خُدا کی دُنیا میں کامل آزادی کے ساتھ بُود و باش کر سکتا ہے اور خارج کر دیئے جانے کا خیال تک بھی اُس کے دل میں نہیں آسکتا۔ اس میں تمام جائز جذبات تکمیل تک پہنچتے ہیں ہر جانب سے مقبولیّت کی آواز کان میں آتی ہے۔ خُدا کی کمال سچائی، خوبصورتی اور نیکی کی رویا نصیب ہوتی ہے۔ عرفان الٰہی درجۂ کمال تک پہنچتا ہے۔ حقیقی مُبارک حالی یہی ہے۔ اس قسم کی زندگی ہمارا خُداوند ہر ایک انسان کو دینا چاہتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خُدا کے ساتھ درست تعلّق اور رشتہ قائم کر لے۔

۳۔ مُبارکبادیوں کے متعلّق ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ اور وہ

ان کی ترتیب ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہماری توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وُہ یہ ہے کہ خُداوند ان مُبارکبادیوں میں بظاہر متضاد باتیں پیش کرتا ہے۔ مُبارک ہیں غریب۔ غمگین۔ حلیم اور ایسا کرنے سے وہ اس تفاوت کو واضح کرتا ہے۔ جو دنیا کی سیرت اور حقیقی سیرت میں پایا جاتا ہے۔ اس بحث میں ہم لفظ "دنیا" اکثر استعمال کریں گے۔ لہذا مناسب ہے کہ شروع ہی میں ہم اس کی تعریف کر دیں اور بتا دیں کہ جب وہ بُرے معانی میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد خُدا کی خلقت نہیں ہے۔ کیونکہ اسے تو خُدا نے اچھا قرار دیا ہے۔ بلکہ اُس کی تعریف یُوں ہو سکتی ہے۔ دنیا وہ انسانی جماعت ہے جو اپنی تنظیم بلا مشارکتِ خُدا کرتی ہے۔ بائبل میں لفظ "دنیا" ان ہی معانی میں مستعمل ہُوا ہے۔ دنیا کا خاصہ ہے کہ وہ بہترین چیزوں کو حاصل کیا چاہتی ہے۔ ہر قسم کے رنج والم سے گریز کرتی ہے اور منتہی درجہ کی خود غرضی سے کام لیتی ہے۔ دنیا کا نصب العین یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے حقوق کو ظاہر کرو۔ اور جو کچھ ہاتھ لگتا ہے لے لو۔ اور خرمندگی اور بے عزتی سے بچو۔ برعکس اس کے خُداوند حقیقی مُبارک حالی اور خوشی کو بالکل مختلف باتوں پر مبنی ٹھہراتا ہے اور پہلی تین مُبارکبادیوں میں سلبی صورت میں اور تقابل کے ذریعہ اس فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ جو دُنیا کی سیرت اور اس سیرت میں پایا جاتا ہے جو وہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مُبارک ہیں غریب۔ مُبارک ہیں حلیم۔ مُبارک ہیں غمگین۔ اِس کے بعد وہ حقیقی مُبارک حالی کی ثبوتی خصوصیات کا ذکر کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ اس میں راستبازی کی زبردست روحانی اشتہا پائی جاتی

ہے۔ اس میں انتہائی رحم و محبت پائی جاتی ہے جو عملی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں خلوص دلی یا یکجہتی پائی جاتی ہے۔ اس میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ اطمینان کی بادشاہت ترقی پائے۔ آخری مبارکبادی میں خداوند اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ ایسی دنیا میں اس قسم کی سیرت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے اور اس کا جواب اس جواب سے جو ایک یہودی مصنف نے خداوند سے کچھ عرصہ پہلے دیا۔ مشابہت رکھتا ہے اور وہ مصنف کتاب حکمت کا لکھنے والا ہے، جو بتلاتا ہے کہ دنیا راستبازوں کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔

"بلکہ ہم راستباز شخص کی گھات میں رہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے کام میں مخل ہے اور ہمارے اعمال کے خلاف شرعی گناہوں پر ملامت کرتا ہے۔ اور ہم پر ہمارے ہی قواعد کی خلاف ورزی کا الزام لگاتا ہے۔

وہ خدا کی معرفت کا دعوے کرتا ہے اور اپنے تئیں خداوند کا خادم کہتا ہے۔ وہ ہمارے خیالات کو برا کہنے لگا ہے۔

اُس کے دیکھنے سے بھی ہمارا جی جلتا ہے۔ کیونکہ اُس کی زندگی دوسروں سے انوکھی ہے اور اُس کے طریقے اجنبی۔

وہ ہمیں کھوٹی دھات گنتا ہے اور ناپاک جانکر ہمارے طریق سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ راستباز کی عاقبت کو خوشحالی کہتا ہے۔ اور یہ دعوے کرتا ہے کہ خدا میرا باپ ہے۔

ذرا دیکھیں تو سہی کہ آیا اُس کی یہ باتیں درست ہیں یا نہیں اور ذرا آزمائیں تو سہی کہ اُس کی زندگی کے انجام پر کیا پیش

آتا ہے۔ کیونکہ اگر راستباز خُدا کا بیٹا ہے تو وہ اُس کو سنبھالیگا اور مخالفوں کے ہاتھ سے اُس کو مخلصی دے گا۔

ہم اُس کو بے عزت کر کے اور عذاب دیکر پرکھیں تاکہ اُس کی بردباری معلوم کریں اور ظلم سہنے میں اُس کا صبر آزمائیں۔ ہم شرمناک موت کا اُس پر فتویٰ دیں۔ کیونکہ اُس کی باتوں کے مطابق اُس سے سلوک کیا جائیگا۔ اُنہوں نے اپنے دل میں ایسے تصور کئے اور بھٹک گئے۔ کیونکہ اُن کی شرارت نے اُنہیں اندھا کر دیا اور اُنہوں نے نہ خُدا کے بھیدوں کو جانا اور نہ پاکیزگی کی مزدوری کی امید رکھی اور نہ اُنہوں نے یہ سوچا کہ معصوم رُوحوں کے لئے کچھ اجر ہے۔[1]

---

"جب میرے سبب لوگ تمہیں لعن طعن کریں گے اور ستائیں گے اور ہر طرح کی بُری باتیں تمہاری نسبت ناحق کہیں گے تو تم مُبارک ہو گے۔ خوشی کرنا اور نہایت شادمان ہونا۔ کیونکہ آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ اس لئے کہ لوگوں نے اُن نبیوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے۔ اسی طرح ستایا تھا۔

---

[1] کتاب حکمت فصل ۲۔ آیت ۱۲ وغیرہ۔

# باب سوم

## مُبارکبادیاں۔ تفصیلی بیان

"مُبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں۔ کیونکہ آسمان
کی بادشاہی اُن ہی کی ہے۔"

عہدِ عتیق میں بہت ایسے بیانات ہیں جو دنیا کی طبیعت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو خود غرضی۔ زر پسندی اور بے رحمی کی طبیعت ہے۔ اور برعکس اس کے بہت سے ایسے بیانات بھی ہیں جو مظلوم غربا کی حالت کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔ انہیں خُدا کے دوست کہا گیا ہے۔ ہمارا خُداوند اس جگہ وہی الفاظ استعمال کرتا ہے اور مقدس لوقا کے بیان کے مطابق فرماتا ہے "مُبارک ہو تم جو غریب ہو افسوس تم پر جو دولتمند ہو"۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ جتنے مالی طور پر غریب ہیں۔ وہ سب مسیح کے شاگرد ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ گناہ جو خاص طور پر دولتمندوں میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی خود غرضی اور لالچ۔ وہ غریبوں میں بھی ہوں۔ لہذا متی کے بیان کے مطابق ہمارا خُداوند سطح سے نیچے اُتر جاتا ہے اور اپنی بادشاہت اور اُس کے باشندوں کی سیرت کی بنیاد دُنیوی غربت پر نہیں۔ بلکہ علیحدگی اور کنارہ کشی پر رکھتا ہے۔ دنیا کہتی ہے "جو کچھ تمہارے ہاتھ لگتا ہے لے لو اور اُس پر قابض رہو"۔ مسیح کہتا ہے۔ "مُبارک ہیں وہ جو کم از

لم دل اور مرضی کے اعتبار سے غریب ہیں"۔

عہدِ عتیق میں ایک آیت ہے جو اس دل کی غریبی کو ظاہر کرتی ہے اور وہ ایوب کا قول ہے[1]۔ "خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو"۔ یہ اعلےٰ درجہ کی قناعت اور کنارہ کشی ہے۔ جو کچھ خدا نے ایوب کو دیا۔ ایوب نے اُسے لیا اور اُس کا درست استعمال کیا۔ اور خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ قادرِ مطلق نے جو کچھ دیا تھا۔ طلب کیا۔ ایوب نے بخوشی تمام واپس کر دیا۔ دُنیا و مافیہا سے کنارہ کشی کرنا یہی دل کی غریبی ہے۔ رسول مقدس فرماتا ہے[2]۔ "پس اگر ہمارے پاس کھانے پہننے کو ہے۔ تو اُسی پر قناعت کریں"۔

ہمارا خداوند اس قسم کے قانع اور کنارہ کش لوگوں کو مُبارک کہتا ہے اور ہم مثال کے لئے اُسی کی زندگی کی طرف آنکھیں اُٹھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ مُبارکبادیاں اُسی کی سیرت پر دلالت کرتی ہیں اور یہ قناعت اور کنارہ کشی اُس کی زندگی میں درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مجسّم اُس کی بہترین دلیل ہے۔ پولوس رسول کے قول کے مطابق اُس نے اپنے آسمانی جاہ وجلال کو خیرباد کہا۔ "اپنے آپ کو خالی کر دیا"۔ اور غریب بن گیا[3]۔ جب وہ انسان بن کر اس دُنیا میں آجاتا ہے تو تمام عمر کسی مادی اور دنیاوی چیز سے اپنا دل نہیں لگاتا۔ وہ تن آسانی ہر دلعزیزی اور اہلِ جاہ و ثروت کی خوشنودی سے احتراز کرتا ہے۔ دوستوں کی ہمدردی سے گریز کرتا ہے۔ یہاں تک کہ صلیب کے

---

[1] ایوب ۱: ۲۱ - [2] ۱ تیمتھیس ۶: ۸ - [3] فلپی ۲: ۷ و ۲ کرنتھی ۸: ۹ -

وقت الٰہی حضوری کی امداد سے بھی محروم رہتا ہے۔ ان تمام نعمتوں کو بغیر کسی قسم کی شکایت کے خیر باد کہتا ہے۔ عام فقیرانہ طریق پر نہیں۔ بلکہ اپنے مشن کی تکمیل اور خُدا کی اطاعت کی غرض سے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل عریاں کر دیتا ہے اور غریب ترین انسان سے زیادہ غریب بن جاتا ہے۔ لہٰذا حقیقی معنوں میں "آسمان کی بادشاہت" اُسی کی تھی۔ مفلس اور غریب اور ستایا ہوا وہ پلاطس کے سامنے کھڑا ہے۔ حاکم اُس سے پُوچھتا ہے کہ کیا تُو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ وہ جواب دیتا ہے "تُو خود کہتا ہے"۔ تمام دنیا کا اخلاقی فیصلہ ہے۔ کہ اُس نے درست کہا۔ اسی طرح ہمیں بھی اُس کی طرح اطاعت اور قربانی کرنا سیکھنا ہے اور جس درجہ تک ہمارے اندر یہ قناعت اور کنارہ کشی پائی جائے گی۔ جس درجہ تک ہم خُدا کی بادشاہت کا اعتراف کرینگے اور اُس کی مرضی کے مطابق اپنا سب کچھ نثار کر دینے کے لئے تیار ہونگے۔ اُسی درجہ تک وہ تمام رکاوٹیں دُور ہوتی جائیں گی۔ جو اُس کی بادشاہت کے اقتدار کو ہمارے دلوں اور زندگیوں میں جمنے نہیں دیتیں۔ پولُوس اس پہلی مُبارکبادی کی تفسیر رسولوں کی مثال سے کرتا ہے "ناداروں کی مانند ہیں۔ تاہم سب کچھ رکھتے ہیں"[1]۔ اسی طرح جب وہ عام طور پر مسیحیوں کو دلاسا دیتا ہے۔ تب بھی مسیح کے ان الفاظ کی توضیح کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ساری چیزیں تمہاری ہیں[2]۔ درحقیقت ہمارا دُنیا کی چیزوں سے دل لگانا جنہیں ہم ضروریات

---

[1] ۲ کرنتھی ۶: ۱۰۔ [2] ۱ کرنتھی ۳: ۲۱۔

زندگی تصوّر کرتے ہیں۔ "اور جن کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔"
ہمارے ناجائز مشاغل جن سے ہم لُطف اندوز ہوتے رہتے ہیں جو ہماری
رُوحانی ترقی میں سدِّ راہ بن جاتے ہیں۔ ہماری خود پسندی اور خود نمائی
وغیرہ یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو ہماری زندگی اور دل کی توسیع اور حقیقی خوشی
اور اطمینان کی تحصیل میں مانع ثابت ہوتی ہیں جن کا دارومدار اس خالص
اور قریبی تعلق پر ہے جو انسانی رُوح اور خُدا میں ممکن ہے۔

وہ وعدہ جو اُس مُبارکبادی کے آخر میں پایا جاتا ہے ایک یہودی
ضرب المثل ہے۔ جس کی مانند دیگر مذاہب میں بھی کہاوتیں پائی
جاتی ہیں۔ کس قدر مختلف ہے۔ "اپنے آپ کو منکسر المزاج بناؤ۔
کیونکہ انسان کا جسم کیڑوں کی غذا ہے۔" لیکن انکسار کی دلیل جو ہمارا
خُداوند پیش کرتا ہے۔ مختلف اور ممتاز ہے۔

آگے چلنے سے پیشتر چاہیئے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہر
زمانہ میں مناسب ہے کہ کلیسیا میں ایسے اشخاص بھی پائے جائیں
جو نہ صرف دل کے غریب ہوں بلکہ دنیوی دولت سے بھی احتراز کریں۔
حقیقت میں ہمارا خُداوند اس قسم کا احتراز اور استغنا ہر ایک سے
طلب کرتا ہے۔ لیکن ایک نوجوان سے خاص طور پر اُس نے طلب
کیا کہ وہ اپنی تمام جائداد کو فروخت کر کے سب روپیہ غریبوں کو تقسیم
کر دے۔ کلیسیا کی تاریخ بیشمار لوگوں کی مثالیں پیش کر سکتی ہے جنہوں
نے خُدا اور انسان کی خدمت کی خاطر عمداً غربت اور مفلسی کو اختیار
کیا اور جب جب اس قسم کی قربانی کی کمی ہوئی۔ کلیسیا کو انتہائی نقصان
پہنچا۔ اس میں شک نہیں کہ دیگر محکموں کی طرح بہت سے مذہبی

فرقے بھی ایسے ہوئے ہیں کہ جن میں لالچ اور تن آسانی کے گناہ نظر آئے ہیں۔ لیکن ان کمزوریوں اور غلطیوں کی وجہ سے ہمیں اس زرّین اصول کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیئے۔ عام طور پر ہمارا خُداوند ایوب کی طرح ہر ایک سے قناعت طلب کرتا ہے۔ لیکن بعض مختص اشخاص سے دنیوی دولت کے متعلّق قطعی احتراز کی توقع کرتا ہے۔

۲

مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں۔ کیونکہ وہ تسلّی پائیں گے۔

بزرگ خریسا سٹم (CHRYSOSTOM) درست فرماتا ہے کہ یہ مبارکبادیاں ایک طلائی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اس مُبارکبادی میں پھر خُداوند ایک ایسی بات کہتا ہے جو دنیا کے مسلّمہ سے بالکل مختلف ہے۔ دنیا کہتی ہے "زندگی میں جتنی خوشی حاصل کر سکتے ہو حاصل کرو۔ اور جتنی باتیں رنج اور بے آرامی کا موجب معلوم ہوتی ہیں۔ اُن سے کنارہ کرو۔ الغرض عقلمندی اور دور اندیشی کو کام میں لاکر جس قدر راحت حاصل کر سکتے ہو کرو۔ اور جہاں تک رنج سے بچ سکتے ہو بچو" لیکن دنیا کے اس قول کے عین منافی ہمارے خُداوند کا قول ہے۔ "مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں"۔

اس کے کیا معنی ہیں؟ دو قسم کے غم ہیں۔ جن کا تجربہ خُداوند کے ہر سچے خادم کو کرنا چاہیئے۔ یعنی گناہ کا غم اور درد کا غم ہمیں گناہ کے لئے غم کرنا ہے۔ کیونکہ ہم گناہگار ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم اس حقیقت کو چھپائیں اور اُسے اپنی ضمیروں پر ظاہر نہ ہونے دیں اور یہ کہکر اپنے آپ کو تسلی دے دیں کہ جن باتوں کو دنیا برداشت کر رہی ہے۔ وہ

ضرور قابلِ برداشت ہوں گی وہ باتیں جو عام طور پر رائج ہیں۔ ضرور اپنے اندر کوئی نہ کوئی خوبی رکھتی ہوں گی۔ لیکن جو مسیحی روشنی میں چلتا ہے۔ وہ خُدا کے کلام کے نُور کی شعاعوں کو اپنے دل کی گہرائیوں تک اُترنے دیتا ہے اور اپنی رُوح کی خاموشی میں اپنے آپ کو خُداوند کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور یوں وہ توبہ کے درجہ تک پہنچتا ہے اور توبہ مستقبل کے لحاظ سے تو مقصد کی تبدیلی ہے۔ لیکن ماضی کے لحاظ سے حقیقی غم ہے۔ گو اس غم میں جذباتی عنصر بہت اُبھرا ہوا نہ بھی ہو تو بھی دلی اور شدید غم ہوتا ہے اور اُن تمام گذشتہ افعال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے جو خُدا کی مرضی کے خلاف سرزد ہُوئے ہیں۔ لہٰذا "مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں"۔

گناہ کے غم کے بعد وہ غم ہے جو دوسروں کے درد کو دیکھ کر ہمدردی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مسیحی کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ اُسے اپنے خُداوند کی طرح جبکہ وہ گتسمنی کے باغ میں تھا۔ "اپنا بوجھ" اُٹھانا پڑتا ہے[۱]۔ لیکن باوجود اس کے مسیح اور پولُوس کی طرح ہر ایک مسیحی کے دل میں گنجائش ہونی چاہیئے کہ دوسروں کے غم بھی اُس میں جگہ پاسکیں۔ "تم ایک دوسرے کا بار اُٹھاؤ"[۲]۔ ہمارے خُداوند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "اُس نے آپ ہماری کمزوریاں لے لیں اور بیماریاں اُٹھالیں"[۳] اور یہ بات نہ صرف صلیب ہی کے متعلق درست ہے۔ بلکہ اُسکی تمام زندگی کے متعلق درست ہے۔ جب وہ گلیل اور یہودیہ میں پھرتا تھا بیمار اور غمزدہ لوگ

---

[۱] گلتیوں ۵:۶۔ [۲] گلتیوں ۲:۶۔ [۳] متی ۱۷:۸۔

ہمیشہ اُس کے پاس آتے تھے اور تسلی پاتے تھے۔ ممکن ہے کہ آسودہ حال لوگ اپنے آپ کو مشترکہ انسانی غم کے دائرے سے باہر سمجھیں ایسا کرنے سے وہ حقیقی اقبالمندی اور خوشی سے محروم رہتے ہیں "جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کر مر نہیں جاتا۔ اکیلا رہتا ہے لیکن جب مرجاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اسے کھو دیتا ہے اور جو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اُسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا"[1] "مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں"[2] کسی نے درست کہا ہے کہ :۔

"جو غم نہیں کرتا وہ اپنی اصلاح بھی نہیں کر سکتا وہ ہمیشہ کے لئے قابلِ رحم ہے۔ زندگی کی مصیبتوں کا احساس نہ کرنا اُن کے علاج سے پہلوتہی کرنا ہے۔ غم کو نظرانداز کرنا قوّتِ دانائی اور رُعب سے محروم رہنا ہے"

گناہ سے توبہ اور دوسروں کے دُکھ درد کے ساتھ ہمدردی کرنے کا نتیجہ وہ فراموشی نہیں جو عارضی اور مضحکہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ حقیقی تسلی اور ہمت افزائی ہے۔ جو خُدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ تاکہ ہم اُس تسلی کے سبب جو خُدا ہمیں بخشتا ہے اُن کو بھی تسلی دے سکیں جو کسی طرح کی مصیبت میں ہیں"۔ "خُدا پرستی کا غم ایسی توبہ پیدا کرتا ہے جس کا انجام نجات ہے اور اُس سے پچھتانا نہیں پڑتا۔ مگر دنیا کا غم موت پیدا کرتا ہے"[3]۔ "مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسلی پائیں گے"

[1] یوحنا ۱۲: ۲۴ و ۲۵۔ [2] ۲ کرنتھی ۱: ۳۔ ۴ [3] ۲ کرنتھی ۷: ۱۰۔

اس جگہ ہم اس بات سے آگاہ کئے دیتے ہیں۔ کہ ایک مصنوعی غم بھی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دنیا کے متعلق ہم میں عدم قناعت پائی جائے۔ لیکن وہ ایمان نہ ہو جو اس عدم قناعت کی وجہ سے اصلاح پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم میں اپنی زندگی کے متعلق عدم قناعت ہو۔ لیکن ہم اس بات کے لئے تیار نہ ہوں کہ انکسار اور سادگی کے ساتھ اپنے خدا باپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کریں اور اس خوشی کو حاصل کریں جو معاف کئے جانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہم ناخوش ہیں لیکن ہماری ناخوشی ہمارے غرور کی وجہ سے ہے نہ کہ حقیقی رنج اور انکسار کی وجہ سے۔ اور یہ ناخوشی کبھی خوشی میں مبدل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اُس نجات کو قبول نہیں کرتی۔ جو خدا ہر ایک انسان کو دینا چاہتا ہے۔ وہ عورت جو گناہگار تھی۔ فوراً اپنی معافی کا یقین کر لیتی ہے اور جلد ہی اُس محبت اور شکرگذاری کا اظہار کرتی ہے جو ہر ایک مغفور انسان کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ ایک مغربی راہب بنام کیشین (CASSIAN) مصنوعی غم پر جو غرور پر مبنی ہے۔ غور کرتے ہوئے حقیقی غم سے یوں اُس کا مقابلہ کرتا ہے[1]۔

لیکن اُس غم میں جو ایسی توبہ پیدا کرتا ہے جس کا نتیجہ دائمی نجات ہے فرمانبرداری۔ نرمی۔ انکسار۔ خوش مزاجی اور صبر پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں کامل ہونے کی آرزو پائی جاتی ہے۔ ایسا غم جسمانی تکلیف اور روحانی تاسف کی ہمیشہ برداشت کرتا ہے اور اُس ناقابلِ بیان خوشی اور اُس زندگی کے باعث جو ترقی کی اُمید سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیشہ صبر اور خندہ پیشانی سے کام لیتا ہے۔ اس غم میں

[1] انسٹی ٹیوٹز (INSTITUES) ۱۹:۹۔

رُوح کے وہ تمام پھل پائے جاتے ہیں۔ جن کا ذکر رسول کرتا ہے۔ لیکن مصنوعی غم تلخ بے صبر۔ سخت کینہ ور اور یاس آفتا ہوتا ہے اور غیر معقول ہونے کی وجہ سے انسان کو ایسے تاسّف اور ریاضت سے باز رکھتا ہے جو مفید ثابت ہوتی ہے اور نہ صرف رُوح کو دُعا کی برکتوں سے محروم رکھتا ہے۔ بلکہ اُن تمام رُوحانی پھلوں سے خالی کر دیتا ہے۔ جو حقیقی غم سے پیدا ہوتے ہیں۔

۳

"مُبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں۔ کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے" اس مُبارکبادی میں بھی ہمارا خُداوند بادشاہت کی خصوصیات کو دنیا کے تصوّرات اور مسلّمات کے مقابلہ میں پیش کر رہا ہے۔ دنیا کہتی ہے "اپنے حقوق کا تحفّظ کرو۔ جہاں تک ترقی کر سکتے ہو کرو۔ کسی کے جبر و تشدّد کی برداشت نہ کرو۔" یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر اپنے رُعب و عزّت کا حد سے زیادہ لحاظ رکھتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ ہمارا خُداوند کہتا ہے "مُبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں"۔ حلیم سے مراد وہ اشخاص ہیں جو دوسروں کی زیادتیوں کی برداشت کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت ہمارے خُداوند کی سیرت کا ایک پہلو ہے۔ لکھا ہے "نہ وہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا اور نہ دُکھ پا کر کسی کو دھمکاتا تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو سچّے انصاف کرنے والے کے سُپرد کرتا تھا"[1]

لیکن اگر ایک اور نکتۂ خیال سے دیکھا جائے تو بعض اوقات ہمیں مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ہمارا خُداوند اُس کی اجازت دیتا ہے جیسا کہ ہم

---

[1] ۱ پطرس ۲: ۲۳

آگے چل کر دیکھیں گے۔ کیونکہ بہت سے ایسے مواقع آپڑتے ہیں کہ ہمیں کلیسیا اور دنیا میں اخلاقی حقیقتوں کے تحفظ کے لئے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس مقابلہ میں بھی اپنی خودی کو مارنا پڑتا ہے اور حقیقی اطمینان اُسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو یہ کہنے کے لئے تیار ہو کہ اگر تم خدا اور انسانی تمدن کے برخلاف جنگ کروگے تو تمہارا مقابلہ کرنا میرا فرض ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخصی حملہ کروگے تو اس کی میں برداشت کروں گا۔ یہ وہ منزل مقصود ہے۔ جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔ چاہیئے کہ ہم جو گناہگار ہیں۔ ہمیشہ اس قسم کی حلیمی سے کام لیں۔ کیونکہ اگر سچ پوچھا جائے تو ہم کسی نعمت کے لائق نہیں اور کوئی ایسا ظلم و تشدد نہیں جس کے ہم مستحق نہ ہوں۔ لیکن یہی حلیمی ہمیں اُس میں دکھائی دیتی ہے جو سراسر بے گناہ اور پاک ہے۔

اُس حلیمی اور خود فراموشی کا نتیجہ یہ ہے کہ خُدا ہمارے تمام مطالبات کو جو اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر میں پورا کرتا ہے۔ "مُبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں"۔ یہاں ہمارا خُداوند زبور کی کتاب سے اقتباس کر رہا ہے۔ "کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے"۔ وارث کس کو کہتے ہیں؟ وارث وہ ہے جو اُس چیز پر قابض ہو جاتا ہے جو اُس کا حق ہے اور کوئی شخص اُسے بیدخل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے مقبوضات کی آزادی کے ساتھ سیر کرتا ہے۔ کیونکہ وُہ درحقیقت اُس کی ملکیت ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ کسی قسم کی مداخلت بیجا کرے۔ اگر ہم دنیا سے ایسے مطالبات کریں۔ جن کی خُدا ہمیں اجازت نہیں دیتا۔ اور خُدا کے حکم کو ردّ کرتے ہوئے صبر و برداشت سے کام نہ لیں۔ تو ایک دن ضرور آئے گا کہ دنیا کا حقیقی مالک ظاہر ہوگا اور ہمیں شرمندہ کرے گا۔ اور چونکہ ہمارے مطالبات اُس کی مرضی کے خلاف رہے ہیں

ہم نے اپنی عزت اور حقوق کی خاطر سختی سے کام لیا ہے اور یوں اُس کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لئے ہم بے دخل کیے جائینگے لیکن حلیموں کو جنہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو سچے انصاف کرنے والے کے سپرد کیا ہے کسی قسم کا خوف نہ ہوگا۔ بلکہ اُن کو کہا جائے گا۔ اَے دوست آگے بڑھ کر بیٹھ۔ اور وہ بتدریج ترقی کرتے جائیں گے اور شاہانہ طور پر اُس وراثت پر قابض ہو جائیں گے۔ جس سے دنیا نے اُنہیں محروم رکھنا چاہا لیکن جس کو خُدا نے اُن کے لئے محفوظ رکھا ہے۔

۴

"مُبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں
کیونکہ وُہ آسودہ ہوں گے"۔

ہمارے خُداوند نے بڑی صفائی اور دلیری کے ساتھ اپنی بادشاہت کے شہریوں کی سیرت کی تصویر کھینچی ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کے مسلمات و متصورات سے وہ کس قدر مختلف و متباین ہے۔ لیکن یہ تصویر ایک سلبی تصویر ہے اور اس سے ہمارے خُداوند کی تسلی نہیں ہوتی۔ لہذا اب وہ اس تصویر کے ثبوتی پہلو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اس نئی بادشاہت کے باشندے "راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں"۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ اشتہا کیا چیز ہے اور کہ بھوک اور پیاس کے کیا معنی ہیں۔ یہ ایک زبردست اقتضائے جسمانی ہے اور اگر یہ پورا نہ کیا جائے تو انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ بھوک اور پیاس کا فراموش کر دینا آسان نہیں ہے۔ یہی بھوک اور پیاس اُس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب انسان مختلف چیزوں کی تحصیل کی کوشش کرتا ہے مثلاً

بعض اوقات مرتبہ کی بھوک پیاس نظر آتی ہے۔ انسان ہر ممکن ذریعہ سے اُسے حاصل کیا چاہتا ہے۔ اسی طرح بعض کو عیش و نشاط کی دُھن سوار ہو جاتی ہے۔ اگر آپ دریائے ٹیمز (THAMES) پر چلے جائیں تو آپ وہاں چند جوانوں کو دیکھیں گے جو کشتی چلانے کی مشق میں ہمہ تن مصروف نظر آئیں گے۔ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ کشتیوں کی دوڑ میں گوئے سبقت لے جائیں۔ اس وقت اُنہیں بھی بھوک اور پیاس ہے۔ اسی طرح بادشاہت کے فرزندوں کے دِل میں راستبازی کی بھوک اور پیاس پائی جاتی ہے اور وہ لوگ مُبارک ہیں جو راستبازی یعنی اُس راستبازی کے جو مسیح کی راستبازی ہے۔ اور جو خُدا نے ہمارے لئے مقرر کی ہے۔ بھوکے اور پیاسے ہیں۔

اکثر اوقات ہم اپنی ناکامیوں کی وجہ سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہم کبھی اپنے گناہوں سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہم میں راستبازی کی بھوک اور پیاس پائی جائے گی تو ہم ضرور آسودہ کئے جائیں گے۔ ہمارے خُداوند نے اپنی جان کا دُکھ دیکھا اور آسودہ ہوا۔ اسی طرح یقین رکھئے۔ کہ آپ بھی آسودہ کئے جائیں گے۔ اگر آپ سچ مچ نیک بننا چاہتے ہیں۔ تو خواہ آپ کی ترقی بہت آہستہ آہستہ ہو تو بھی آپ ضرور کسی دن منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ آسودہ کرنا خُداوند کا کام ہے۔ بشرطیکہ آپ میں اشتہا پائی جائے اور قائم رہے۔ نیکی کی تلاش میں اگر کوئی ناکامی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ بھوک و پیاس جاتی رہے یا یوں کہیں کہ یہ آرزو اور دُعا اور کوشش ختم ہو جائیں۔ کیا آپ سچ مچ راستبازی کے خواہاں ہیں۔ اگر

ہیں تو سمجھئے کہ راستبازی آپ کو مل گئی اور نہ صرف آپ کو بلکہ تمام دُنیا کو۔ خُداوند کا وعدہ ہے۔ "عدالت صداقت کی طرف پھر کے آوے گی اور وے سب جن کے دِل سیدھے ہیں۔ اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے۔" وہ دن آنے والا ہے۔ جب آسمان کی بادشاہت۔ راستبازی۔ حلم اور صداقت کی بادشاہت دُنیا میں دیدنی طور پر قائم کی جائے گی۔ مُبارک ہیں وہ جو اس وقت اندرونی اور بیرونی طور پر راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہوں گے۔ کیونکہ وہ آسودہ کئے جائیں گے۔

۵

"مُبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔"

اس میں شک نہیں کہ انسان کے دل میں ہمیشہ دُکھ اور مصیبت کو دیکھ کر رحم پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مسیح سے پیشتر انسان کی زندگی میں رحم کبھی ایسا محرّک ثابت نہیں ہوا کہ دُوسروں کی نجات اور خود اپنی بہتری اور بخشش کا باعث ہوا ہو۔ بُدھ جو کہ بہتر اور مقدّس ترین انسانوں میں سے ایک ہوا ہے۔ انسانی تکلیف کا اندوہناک منظر دیکھ کر جس میں ضعف، مرض اور موت نظر آتے تھے۔ اپنی عیش و عشرت کی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں اور وہ یکدم اپنی شاہانہ زندگی کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور بہت تلاش اور تجسّس کے بعد وہ اپنے خیال کے مطابق زندگی سے رہائی حاصل کرنیکا ایک طریقہ دریافت کرتا ہے اور رحم کی وجہ سے دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔ بُدھ کی تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ زندگی کو ایک قبیح چیز بتلاتا ہے۔ وہ زندگی سے کنارہ کشی کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ اُس

کے نزدیک زندگی کی اصلاح اور نجات ناممکن ہے۔ ارسطو جو کہ ایک اعلےٰ پایہ کا فلسفی ہُوا ہے اور جس نے جذباتِ انسانی کا باغور مطالعہ کیا اور ان کی ایک فہرست تیار کی۔ ضرور جذبۂ رحم سے دوچار ہوا ہوگا۔ لیکن وہ اُسے ایک غیر ضروری اور تکلیف دِہ چیز خیال کرتا ہے اور صلاح دیتا ہے کہ عملی زندگی سے اُسے بالکل نکال دینا چاہیئے۔ اُس کے نزدیک وہ تمام رنج آشنا قصص اور کہانیاں جو یونانی ادبیات میں پائی جاتی ہیں اس غرض سے تحریر نہیں کی گئیں کہ جذبۂ رحم کی تقویت ہو۔ بلکہ اس غرض سے کہ عالم خیال میں ہی اس کا اخراج ہو جائے اور عالم عمل میں اس کا دخل نہ ہو اور یوں اہلِ یونان ہمیشہ متین اور مستقل مزاج رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اکثر ادبیات سے محض اتنا ہی کام لیتے ہیں۔ انسانی رنج و مصیبت کی تصویریں ہمارے جذبۂ رحم کو مشتعل تو کر دیتی ہیں اور ایک پُر کیف حالت بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے نہیں بڑھتیں اور کبھی ہمیں اس رنج و مصیبت کی مدافعت کے لئے مجبور نہیں کرتیں۔ یہ غیر مسیحی تصوّر ہے۔ مسیحی کے لئے رحم محرّک ہے۔ جو فوری عمل کی تحریک کرتا ہے۔ خُدا بھی مسیح میں ہو کر اپنی قدرت کو رحم اور ترس کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ رحم مفید رحم ہوتا ہے جو جلد عالم خیال سے عالم عمل میں منتقل ہو جائے اور مخلصی اور نجات کا موجب ٹھہرے۔ خُداوند اسی قسم کے رحم کے بارے میں کہتا ہے "مُبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں"۔ عہدِ جدید میں ایسے رحم کو جو بے عمل ہو ریاکاری بتلایا ہے[1]۔

کلام کہتا ہے کہ وہ جو رحمدل ہیں، اُن پر رحم کیا جائے گا۔ یہاں خُدا

---

[1] یعقُوب ۲: ۱۵-۱۶ + ۱ یُوحنّا ۳: ۱۷-۱۸۔

کے طریقِ عمل کے متعلق ایک زبردست قانون پایا جاتا ہے۔ خدا ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو ہم اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ عہدِ عتیق میں لکھا ہے "رحم کرنے والے کو تو اپنے تئیں رحیم دکھلاتا ہے اور نیکی کرنے والے پر آپ کو نیکی کرنے والا ظاہر کرتا ہے خالص کو تو اپنے تئیں خالص دکھلاتا ہے اور کجروؤں کے ساتھ تو کجرو معلوم ہوتا ہے"۔ اسی طرح ہمارے خداوند کی تمثیل[1] میں دکھایا گیا ہے کہ جب اُس نوکر نے جس کے مالک نے اُس کا قرض معاف کر دیا تھا۔ اپنے ہمخدمت نوکر کو جو اُس کا مقروض تھا۔ معاف کرنے سے انکار کیا تو وہ معافی واپس لے لی گئی اور اُسے تمام قرض ادا کرنا پڑا۔ اس تمثیل سے خداوند ہم پر یہ ظاہر کیا چاہتا ہے کہ جیسے ہم آپس میں ایک دوسرے سے پیش آتے ہیں۔ ویسے ہی خدا ہم سے پیش آتا ہے۔ یہی حقیقت قوموں کی عدالت کے بیان میں واضح کی جاتی ہے۔ جب ہمارا خداوند کہتا ہے "چونکہ تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ کیا۔ اس لئے میرے باپ کے مبارک لوگو۔ جو بادشاہت بنائے عالم کے وقت سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ اُسے میراث میں لو"۔ اسی طرح ہم ربانی دُعا میں کہتے ہیں۔ "ہمارے قصوروں کو معاف کر۔ کیونکہ ہم بھی اپنے قصوروروں کو معاف کرتے ہیں"۔ اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں کہ آخری دن خدا ہم سے کیونکر پیش آئے گا تو اس کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کی نظرِ ثانی کریں اور دیکھیں کہ ہم اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہم جنس انسان بھی ہمارے

---

[1] متی ۱۸: ۲۳ وغیرہ۔

ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہم اُن کے ساتھ کرتے ہیں۔ جیسے کوئی کہتا ہے ویسی سنتا ہے۔ اگر کوئی شخص رحمدل ہے تو عنقریب تمام انسان اُس کی طرف کھنچے آئیں گے اور اُس کی طرف نیکی کا سلوک کریں گے۔ "شاید کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دینے کی جرأت کرے"[1]۔ "مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں۔ کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا"۔

۶

"مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے"۔

اگر ہم بادشاہت میں حصّہ چاہتے ہیں تو ہمارے مقصد میں یکسوئی اور یکجہتی ہونی چاہیئے۔ عام طور پر پاکدلی کے معنی محض نفسانی خواہشات اور بداعمال کی عدم موجودگی سمجھے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پاکدلی کا یہ ایک ضروری عنصر ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ جو بُری خواہشوں اور آزمائشوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اُس کی خاص وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ محض اسی ایک اعتبار سے گناہ سے رہائی حاصل کیا چاہتے ہیں۔ لیکن کُل نیکی کی پیروی نہیں کرتے۔ دل اور زندگی کی ناپاکی سے تو اُنہیں نفرت ہے۔ اُن کی ضمیر اور خودداری کو اُس سے تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن غرور۔ عدم تعظیم اور محبت کی کمی سے اُنہیں رنج نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ "پاک زندگی بسر کرنا ناممکن" ہے۔ مسیحی خادم الدین کے لئے اس خیال کی تردید کرنا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ لوگ پورے طور پر مذہبی زندگی بسر کرنا اور مسیح کے نمونہ پر چلنا نہیں چاہتے۔ ناپاکی پر غالب آنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ محض اُس ایک گناہ کا مقابلہ کیا جائے۔ بلکہ یہ کہ پاکیزگی کو اُس

---

[1] رومیوں ۵: ۷

کے تمام پہلوؤں سمیت حاصل کیا جائے۔ ہر بات میں مسیح کی مانند بننے کی کوشش کی جائے اور اُس پاک دلی کی جستجو کی جائے۔ جس کی تلقین خُداوند یسُوع مسیح نے کی ہے اور جس کا ذکر زبور ۵۱ میں ہے اور جس کا مترادف "مستقیم رُوح" استعمال ہُوا ہے۔ الغرض پاکدلی ارادے اور مقصد کی یکسوئی ہے۔ جس کا نصب العین ہمیشہ خُدا ہے۔ لاطینی زبان میں ایک ضرب المثل ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ "اگر برتن صاف نہ ہو تو جو کچھ اُس میں ڈالا جائے گا۔ ترُش ہو جائے گا"۔ یہی حالت انسانی ارادہ کی ہے۔ اگر اُس کا مطمعٔ نظر خُدا نہ ہو تو جو کچھ بھی اخلاقی اور مذہبی مساعی کے برتن میں ڈالا جائے گا۔ ترُش اور تلخ ہو جائے گا اور تمام زندگی کو بے لطف بنا دیگا۔ اسی لئے خُداوند کہتا ہے کہ "مُبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں"۔ یعنی جن کے سامنے ایک واحد مقصد ہے۔ کیونکہ گو ابھی وہ خُدا کو نہیں دیکھ سکتے اور مسیحی دین کے مسلمات میں سے ایک پر بھی عامل نہیں۔ لیکن ایک دن ضرور اُنہیں چشمِ بصیرت عنایت ہوگی جو سچائی۔ خوبصورتی اور نیکی کو دیکھ سکے گی۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہیں کہ وہ خُدا کو دیکھیں گے۔

اس قسم کا رُوحانی مکاشفہ جو ایوب کو اُس وقت حاصل ہُوا۔ جب خُدا اُس کے تمام سوالات کا جواب دے چکا۔ دیدارِ الٰہی کہلانے کا مستحق ہے اور حقیقی توبہ[1] اور روحانی ثابت قدمی کے لئے یہ کشف نہایت ضروری ہے۔ یہ رویتِ الٰہی پُوری تسلی اور اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ انسانی مساعی کی اِنتہائی منزل اور ان کا آخری انعام ہے۔ جو "ایمان

---

[1] ایوب ۴۲: ۵ + متی ۵: ۸۔ دیکھو خواب جیرونٹیس (DREAM OF GERONTIUS) از کارڈینل نیومن۔ [2] عبرانیوں ۱۱: ۲۷۔

پر چلتے ہیں۔ نہ کہ آنکھوں دیکھے پر۔" اس کی کاملیت میں وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی تلاش انسان کو رہتی ہے۔ یعنی دماغ کے لئے پوری آسودگی۔ ارادے کے لئے تعمیلِ آرزو اور دل کے لئے محویت و بے خودی جو خُدا میں حاصل ہوتی ہے۔

۷

"مُبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خُدا کے بیٹے کہلائیں گے"

مسیح صلح کا شہزادہ ہے۔ وہ انسانوں میں صلح اور سلامتی قائم کرتا ہے۔ افراد۔ اقوام اور جماعتوں کی جدائی کی دیواروں کو گرا دیتا ہے۔ لیکن پیشتر اس سے کہ ہماری آپس کی صلح ممکن ہو وہ ہماری صلح خُدا سے کرواتا ہے۔ کیونکہ یہی انسانی صلح اور سلامتی کی حقیقی بنیاد ہے۔ دنیا میں محض سطحی اور ظاہری قسم کی صلح بھی ہوتی ہے۔ لیکن صلح اور سلامتی کا شہزادہ اس صلح کو دُنیا سے نکالنا چاہتا ہے۔ "یہ نہ سمجھو کہ مَیں زمین پر صلح کرانے آیا۔ صلح کرانے نہیں۔ بلکہ تلوار چلانے آیا ہُوں[1]"۔ وہ صلح جو حقیقت کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہرگز خُدا کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن وہ صلح جو حقیقت پر مبنی ہے۔ وہی اُس کی خوشنودی کا باعث ہے اور وہ ہمیشہ ہمارے خُداوند کی طرح ہماری نظروں کے سامنے ہونی چاہیئے۔

کیا ہم اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ ہمارے خُداوند کو ان تفرقوں سے جو مسیحی کلیسیا میں پائے جاتے ہیں۔ رنج ہوتا ہے۔ کیا ہم اس بات کو یاد رکھتے ہیں کہ وہ ان مسیحی اقوام کے سامان جنگ کو دیکھ کر جو ایکدوسرے

---

[1] متی ۱۰: ۳۴۔

کو نفرت اور مغائرت کی نظر سے دیکھتی ہیں کس قدر کڑھتا ہے۔ کیا ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا خداوند اُن دشمنیوں اور رقابتوں کو دیکھ کر جو افراد اور مختلف جماعتوں میں پائی جاتی ہیں رنجیدہ ہوتا ہے یقیناً وہ تمام حسد اور عناد جو خادمان دین اور کلیسیا کے دیگر کارگذار عمل اور شرکائے کلیسیا کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اُس کی مرضی اور طبیعت کے بالکل برخلاف ہے۔ کیونکہ ہم اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ پاک عشاء کی ضیافت میں نہ صرف مسیح کے ساتھ اتحاد ہوتا ہے۔ بلکہ انسان کے ساتھ بھی۔

مسیحیوں کا فرض ہے کہ وہ اس صلح کو دنیا میں قائم کریں جسے مسیح نے قائم کیا ہے اور یہ افراد خاندانوں۔ جماعتوں۔ کلیسیاؤں اور قوموں میں صلح کرانے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا یہ دلیل ہے کہ ہم اپنی کلیسیائی اور شہری حیثیت میں اپنی دعاؤں اور اعمال کے ذریعہ شخصی اور منصبی حالت میں صلح کرانے کی باقاعدہ مسلسل اور ان تھک کوششوں میں مصروف ہیں؟ اگر یہ بات ہمارے متعلق سچ ہے تو یاد رکھئے کہ ہمارا انعام بہت ہی بڑا ہے۔ ہم خدا کے بیٹے تسلیم کئے جائیں گے۔

۸

"مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُنہیں کی ہے"

مذکورہ بالا آیات میں مسیحی سیرت کی دلفریب تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ اس میں دنیا سے

کنارہ کشی ہے۔ انسانی دُکھوں سے ہمدردی ہے۔ انکسار اور خود فراموشی ہے۔ راستبازی کی بھوک اور پیاس ہے۔ عملی رحمدلی ہے۔ ارادہ کی یکسوئی اور پختگی ہے۔ صلح کرانے کی خواہش اور آرزو ہے۔ لیکن جہاں لوگ اس سیرت کا خیر مقدم نہیں کرتے۔ وہاں اس کی خوبصورتی مثل خار کے چبھتی ہے۔ وہاں اس کی پاکیزگی دلوں کو اور بھی زیادہ سخت کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب یہ سیرت اپنے پورے کمال کے ساتھ ہمارے خُداوند کی شخصیت میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اہلِ دُنیا اُسے قبول نہیں کرتے۔ بلکہ اس خُداوند کو قتل کر دیتے ہیں۔ وہ خُداوند جانتا ہے کہ دنیا کی نظر میں راستبازی کی کیا منزلت ہے۔ اسی لیئے وہ آخری مُبارکبادی اپنی زبان سے نکالتا ہے اور اپنے شاگردوں پر خصوصیت کے ساتھ اس کا اطلاق کرتا ہے۔

"جب میرے سبب لوگ تمہیں لعن طعن کریں گے اور ستائینگے اور ہر طرح کی بُری باتیں تمہاری نسبت ناحق کہیں گے تو تم مُبارک ہوگے۔ خوشی کرنا اور نہایت شادمان ہونا۔ کیونکہ آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ اس لیئے کہ لوگوں نے اُن نبیوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے اسی طرح ستایا تھا۔

## دُنیا میں مسیحی سیرت کی جگہ

جس وقت کوئی شخص یہ فیصلہ کرتا ہے کہ میں اس مسیحی سیرت کو حاصل کروں گا تو اُسی وقت شیطان اُس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ کیا تو کسی ایسی چیز کی تحصیل کی کوشش تو نہیں کر رہا جو نہایت

ہی اعلےٰ اور ارفع ہونے کی وجہ سے ناقابلِ حصول ہے؟ اور کیا اس مقصد کو تُو لے کر دُنیا میں کوئی بھلائی کر سکتا ہے؟ اگر تُو اہلِ دنیا کی امداد کیا چاہتا ہے تو تجھے اُن کی مانند ہونا چاہیئے۔ دنیا میں رہنا اور پھر دُنیا سے کنارہ کشی کرنا یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ ہمارا خُداوند اس قسم کے استدلال کی توقع کرتا ہے۔ لہٰذا وہ یُوں جواب دیتا ہے۔ تمہیں انسان کے مشابہ ہو کر نہیں۔ بلکہ انسان سے مختلف ہو کر اُس کی مدد کرنا ہے۔ تمہاری مدد کا یہ طریقہ نہ ہوگا کہ تم اُن کے سامنے ایک ایسی سیرت پیش کرو جو اُن کی سیرت سے قدرے بہتر ہو بلکہ جو بالکل نرالی ہو اور خُدا کی محبت سے پُر ہو۔ کچھ عرصہ تو ضرور وہ اس کا مضحکہ اُڑائیں گے لیکن ملاحظے کے دن جب مصیبت آن گھیرے گی۔ جب محض ظاہرداری کام نہ دیگی۔ جب ٹھوس اور بنیادی حقیقتوں کی ضرورت پڑے گی۔ تب وہ اس معیار کے لئے جو ہم نے اُن کے سامنے قائم کیا ہے۔ خُدا کی بڑائی کریں گے۔ تب وہ تمہاری طرف رجوع ہوں گے۔ کیونکہ وہ محسوس کریں گے کہ تمہارے پاس ایک ایسی چیز ہے جو سچ مچ قیمتی اور قابلِ قدر ہے۔

لہٰذا ہمارا خُداوند اس سوال کا کہ اس موجودہ دنیا میں کیونکر اس قسم کی سیرت جڑ پکڑ سکتی ہے اور کیونکر مفید اور کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ یُوں جواب دیتا ہے کہ یہ سیرت اپنی تخصیصی اور امتیازی خوشبو سے دنیا کو پاک اور صاف کرتی ہے۔ اپنے اعلےٰ معیار اور اُس کی پیروی سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے اور دُنیا سے مختلف ہونے کی وجہ سے دنیا کی توجہ کو تسخیر کرتی ہے۔ ذیل کے اشتہارات کے جو مُبارکبادیوں کے بعد مرقوم ہوئے ہیں یہی معنی ہیں۔

"تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزا جاتا رہے
تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا؟ پھر وہ کسی کام کا
نہیں۔ سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے
پاؤں کے نیچے روندا جائے۔ تم دنیا کے نور ہو۔ جو شہر
پہاڑ پر بسا ہوا ہے۔ وہ چھپ نہیں سکتا۔"

"تم زمین کے نمک ہو"۔ نمک ایک ایسی چیز ہے جو اپنی مختلف اور زبردست خوشبو سے اشیا کو پاک اور صاف کرتی ہے۔ "تم دنیا کے نور ہو" نور تاریکی میں ایک مختص اور ممتاز جگہ رکھتا ہے۔ "جو شہر پہاڑ پر بسا ہوا ہے"۔ وہ جاذب توجہ ہے اور قرب و جوار کے تمام علاقہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

"تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا؟" وہ مسیحیت جس کے دعوے اور عمل میں مطابقت نہیں اُس نمک کی مانند ہے جس کا مزہ جاتا رہا۔ اب وہ کس چیز سے نمکین کی جائیگی؟ اب اس کا گم شدہ اثر اور مرتبہ کیونکر بحال کیا جا سکتا ہے؟ ایسے مسیحی ہونے سے جو کہیں کچھ اور کریں کچھ مسیحی نہ ہونا بہتر ہے۔ کسی مذہب کی پیروی کا بے بنیاد اور جھوٹا دعوے کرنا بالکل بیکار اور غیر مفید ہے۔ "پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے"۔ کاش کہ تُو سرد یا گرم ہوتا۔ پس چونکہ تُو نہ تو گرم ہے نہ سرد۔ بلکہ نیم گرم ہے۔ اس لئے میں تجھے اپنے مُنہ سے نکال پھینکنے کو ہوں[1]۔ مسیحیوں

---

[1] مکاشفہ ۳: ۱۵-۱۶۔ میرے خیال میں ان الفاظ سے رسول کی یہ مراد نہیں کہ لودیکیہ کی کلیسیا اخلاقی طور پر یا تو بہتر ہوتی یا بدتر۔ بلکہ یہ کہ یا تو وہ بہتر مسیحی ہوتے یا بالکل مسیحی نہ ہوتے۔

کا فرض ہے کہ دُنیا پر اُس انقلاب کو ظاہر کریں۔ جو مسیحیت نے اُن کی زندگی میں پیدا کیا ہے۔

"اور چراغ جلا کر پیمانے کے نیچے نہیں۔ بلکہ چراغدان پر رکھتے ہیں۔ تو اُس سے گھر کے سب لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ اسی طرح تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں"۔

ہم خُداوند کی اس تعلیم کا مطلب واضح کرنے کے لئے ایک اور بڑے مذہبی اُستاد کی تعلیم سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ مسلم ممالک میں زیادہ لوگ بہتر مسلم ہیں بہ نسبت مسیحی ممالک میں مسیحیوں کے۔ شاید یہ دعوےٰ درست ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد صاحب نے ان لوگوں کے سامنے جن سے اُن کا سابقہ پڑا ایک ایسا چال چلن پیش کیا۔ جس کے متعلق اُنہیں امید تھی کہ طبعی طور پر مرغوب ثابت ہوگا۔ اور چونکہ ان کے مذہبی مطالبات میں سیرت کی تبدیلی یا کوئی رُوحانی انقلاب نہ تھا۔ اس لئے محمد صاحب کو یقین تھا کہ چند مذہبی رسومات کا عمل میں لانا جنگ میں شریک ہونا اور شراب سے پرہیز کرنا یہ ایسے امور ہیں۔ کہ وہ لوگ ضرور اُنہیں تسلیم کر لیں گے اور ان پر کاربند ہوں گے چنانچہ اِنہیں باتوں کو آپ نے خُدا کے احکام بتلا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور بہت درجہ تک کامیابی حاصل کی۔ مسلمان عام طور پر بہادری پرہیزگاری اور رسُومات مذہبی کی ادائیگی کے لئے مشہور ہیں لیکن محمد صاحب نے بہت ہی معمولی اور ادنےٰ مطالبات پر اکتفا کی اور

انسان کی روحانی تبدیلی اور نئی پیدائش کو طلب نہیں کیا۔ اس لئے اسلام روحانی ترقی کے اعتبار سے محدود و مسدود رہا ہے۔

لیکن ہمارے خُداوند نے فرمایا ہے کہ جب تک کوئی نئے سرے سے پیدا نہ ہو۔ یعنی جب تک اس میں ایسا زبردست انقلاب رونما نہ ہو جو نئی پیدائش کے نام سے نامزد کیا جا سکے۔ وہ خُدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا۔ اور خُداوند نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ نئی پیدائش انتہائی خود انکاری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نسبت ہمارے خُداوند کے مذہب کے سچے پیرو کم ہیں۔ لیکن اُنہی چند سچے مسیحیوں کے ذریعہ مسیحیت نے انسانی تمدن میں ایک زبردست روحانی تجدید پیدا کر دی ہے۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ کلیسیا نے مختلف زمانوں میں اپنے خُداوند کے طریق کار کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ فرینکز (FRANKS) کے بپتسمہ کے موقع پر کلیسیا نے بغیر مناسب تعلیم کے بڑے بڑے گروہوں کو مسیحیت میں شامل کر لیا اور محض اس خیال سے کہ قوم کی قوم مشرف بہ مسیحیت ہو جائے۔ مسیحی معیار کو بالکل ادنیٰ بنا دیا۔ اسی طرح ایک زمانہ آیا کہ بعض جزوائٹ (JESUITS) صاحبان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ لوگوں کو کیتھولک رکھنے کے لئے اگر مسیحی اخلاق کا بھی خون کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح انگریزی کلیسیا نے بھی محض اس غرض سے کہ "قومی کلیسیا" کے تصور کو کسی قسم کا ضعف نہ پہنچے۔ رُوحانی تادیب کے تمام اختیارات جو محض کلیسیا کا حق ہیں۔ ایک ایسی پارلیمنٹ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ جسے مسیحیت سے کچھ بھی سروکار نہیں ہے۔

مذکورہ بالا حالتوں میں کلیسیا نے مسیح کے طریق کار کے خلاف عمل کیا۔ اس نے حقیقت کو تعداد پر اور مسیحیت کی سچّی پیروی کو سیاسی مفاد پر قربان کیا اور یوں ہر حالت میں نمک نے اپنا مزہ کھو دیا۔

اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا؟ کیا ہم میں مسیحیّت کا مزہ اس درجہ تک زائل ہو چکا ہے کہ اب اُس کا بحال کیا جانا ناممکن ہے؟ خُدا کا شکر ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اُس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اہلِ دُنیا پر ظاہر کرنا پڑے گا کہ جس طرح کلیسیا کا ایک عقیدہ ہے۔ جس پر وہ ہمیشہ کاربند ہے ایک خدمت اور چند ساکرامنٹس ہیں۔ جن کی انجام دہی اُس کے سپُرد ہے۔ اسی طرح ایک اخلاقی معیار بھی کلیسیا کی تحویل میں رکھا گیا ہے جس کو دوبارہ تعمیر کرنا اور اُس پر عمل پیرا ہونا کلیسیا کا فرض ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اُس پر بے ثمری کی لعنت پڑے۔ کلیسیائی زندگی میں تازگی اور بیداری اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہیں۔ جب دنیا کے لوگوں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ مسیحی اخلاقی معیار زندگی کے مختلف پہلوؤں مثل شادی۔ خاندان۔ تجارت۔ اور سیاسیات وغیرہ کے متعلق کیا ہے اور کہ اس معیار کو نظر انداز کر دینا اُسی قدر ناممکن ہے۔ جس قدر مسیحی عقیدہ اور ساکرامنٹس سے انکار کر دینا ناممکن ہے۔

# باب چہارم

## پُرانی شریعت کی نظرِ ثانی

ہمارے خُداوند کے فرمان کے مطابق نئی بادشاہت کے شہریوں کی سیرت ایسی متحیر کرنے والی اور متضاد باتوں سے بھری ہوئی ثابت ہوئی۔ کہ خواہ مخواہ لوگوں میں خُداوند کے متعلّق اس قسم کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ کیا یہ انقلاب پسند شخص پُرانی شریعت کو بالکل برباد کر دے گا؟ کیا یہ تحریک جو اس نے شروع کی ہے۔ مذہبی اور اخلاقی عالم میں انقلاب پیدا کیا چاہتی ہے۔ ہمارا خُداوند ان سوالات کا جواب دیا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس باب کا بقیہ حصّہ یعنی متّی باب ۵۔ آیت ۱۷ سے آخر تک اُس تعلّق کو ظاہر کرتا ہے جو نئی بادشاہت کی راستبازی اور مُوسوی شریعت کی راستبازی میں پایا جاتا ہے۔

ہمارا خُداوند بتلاتا ہے کہ نئی شریعت کا تعلّق پُرانی شریعت کے ساتھ دوگونہ ہے۔ اوّل تو یہ کہ نئی شریعت پُرانی شریعت کے ساتھ ایک ہی سلسلہ میں پیوست ہے (آیات ۱۷-۱۹) دوم (آیات ۲۰-۴۸) یہ کہ نئی شریعت پُرانی شریعت پر سبقت لے جاتی ہے۔ جیسا کہ مکمل غیر مکمل پر سبقت لے جاتا ہے۔

(۱) ذیل کی آیات سے خُداوند اُس ربط کو ظاہر کرتا ہے۔ جو پُرانی اور نئی شریعت میں پایا جاتا ہے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے

آیا ہُوں۔ منسُوخ کرنے نہیں بلکہ پُورا کرنے آیا ہُوں۔ کیونکہ
مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ
جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا۔
جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی ان چھوٹے
سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں
کو سکھائے گا۔ وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا
کہلائے گا۔ لیکن جو اُن پر عمل کرے گا۔ اور اُن کی تعلیم دے گا
وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا"۔

یہاں ہم عمل کا وہ اصول دیکھتے ہیں جس پر خُدا کاربند ہے۔ خدا ناقص
کو دیکھ کر محض اس وجہ سے کہ وہ ناقص ہے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ کبھی کسی
جماعت یا فرد کی موجودہ حالت کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ اُس حالت پر غور کرتا ہے
جو مستقبل میں ہونے والی ہے۔ وہ اس کی موجودہ خوبیوں اور کامیابیوں
پر لحاظ نہیں کرتا۔ بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس قسم کی ترقی کر رہا ہے اور
اُس کا رُخ کس سمت ہے۔ جو چیز درست سمت کی جانب رُخ کئے
ہوئے ہے۔ وہ خُدا کے نظام پروردگاری کے مطابق ضرور منزل مقصُود
کو پہنچ جائے گی۔ عہدِ عتیق کی عین یہی حالت تھی۔ وہ ناقص تھا لیکن اُس
کا رجحان درست تھا۔ چنانچہ بزرگ اریئیس (IRENAEUS) درست فرماتا
ہے۔ خُدا کے احکام یہودیوں کے لئے اور ہمارے لئے مشترکہ ہیں۔ فرق
صرف اتنا ہے کہ یہودیوں کے لئے وہ احکام اپنی ابتدائی حالت
میں تھے۔ ہمارے لئے وہ اپنی انتہائی حالت میں ہیں۔ اسی طرح بزرگ
ہرگٹین کا قول ہے۔ عہدِ جدید عہدِ عتیق میں پنہاں ہے۔ اور عہدِ عتیق عہدِ

جدید میں نمایاں ہے۔ اس جگہ ہمیں الٰہی تعلیم و تربیت کا طریقہ دکھائی دیتا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ وہ تمام باتیں جن کا آغاز عہدِ عتیق میں ہوتا ہے۔ وہ عہد جدید میں تکمیل تک پہنچتی ہیں۔

مثال کے طور پر پیشینگوئی کو لے لیجئے۔ عہد عتیق میں مبہم اشخاص کے ذریعہ ایک تصور پیش کیا جاتا ہے جو مستقبل سے تعلق رکھتا ہے اور وہی تصور مسیح اور اُس کی بادشاہت میں عملی جامہ پہن لیتا ہے۔ علاوہ ازیں رسولوں کے اعمال اور متی کی انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسیحی اپنے زمانے میں عہدِ عتیق کی باتوں کی تکمیل کے منتظر تھے۔ وہ عہدِ عتیق کو پیش خبری خیال کرتے تھے۔ اور عہدِ جدید کو اُس کی تکمیل تصور کرتے تھے۔ پھر رسمی شریعت کو لے لیجئے احبار کی کتاب میں رسمی شریعت کے قوانین مرقوم ہیں۔ اس کے بغیر عبرانیوں کے خط کا مطالعہ کیجئے اور آپ دیکھیں گے کہ عبرانیوں کے خط کے مصنف کے نزدیک جو ایک روحانی یہودی مسیحی ہے۔ پُرانی شریعت محض تہذیب ظاہر سے تعلق رکھتی ہے اور کہ وہ تمام باتیں مسیح میں روحانی معنی حاصل کرتی ہیں۔ اسی طرح اخلاقی شریعت کو لے لیجئے اور ذرا دس احکام کا جو عہدِ عتیق میں پائے جاتے ہیں ہمارے خداوند کے پہاڑی وعظ یا یعقوب کے خط سے مقابلہ کیجئے اور آپ دیکھیں گے کہ اُن میں وہی تعلق پایا جاتا ہے جو ابتدائی تعلیم اور انتہائی تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو پولُس رسول یوں پیش کرتا ہے۔ کہ شریعت بمنزلہ اُس تعلیم و تربیت کے ہے جو غلاموں یا بچوں کو دی جاتی ہے تاکہ وہ فرزندیت اور بلوغ کے لئے تیار کئے جائیں۔

اور یہ وہ زمانہ ہے۔ جب رُوح عنایت ہوتی ہے۔

آخر میں چند مختلف سیرتوں کا ملاحظہ کیجئے۔ مثال کے طور پر یعقوب اور عیساؤ کو لے لیجئے۔ ان کے متعلق فیصلہ کرنا نہایت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ ہم کیونکر یعقوب کو قابلِ تعریف تصوّر کر سکتے ہیں جس حال کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دھوکے باز تھا۔ برعکس اس کے ہم عیساؤ پر کیونکر فتوے لگا سکتے ہیں۔ جبکہ وہ ہمیں سخی اور جلد باز نظر آتا ہے۔ اس کا جواب دقیق مگر درست ہے اور وُہ یہ کہ عیساؤ کی جلد بازی نتیجہ خیز یا باز آور نہیں ہوتی۔ بلکہ کُل نسل ادوم کے ذریعہ جس کا بانی مبانی عیساؤ ہے۔ جسے عبرانیوں کا مصنّف "بے دین"[1] کہتا ہے۔ کوئی نئی بات بھی پردۂ ظہور میں نہیں آتی۔ کوئی قابل قدر تبدیلی اُن کے وسیلے سے نہیں ہوتی اور کوئی چیز اُن کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتی لیکن یعقوب باوجود اپنی دروغ گوئی کے خُدا کے وعدوں کی قدر پہچانتا ہے اور اُس کی نسل خُدا کی قربت میں رہتی ہے۔ اسی لئے بنی اسرائیل کی تواریخ ایک قابلِ قدر تواریخ ہے۔

وہ تمام باتیں جو عہد عتیق میں ناقص اور نامکمل نظر آتی ہیں۔ اور یاد رہے کہ اُس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں۔ وہ عہد جدید میں کامل کی جاتی ہیں اور چونکہ وہ باتیں بھی خُدا کی مرضی کا مظہر ہیں۔ اس لئے وہ قابل عزّت ہیں۔ لہذا ہمارا خُداوند اپنے شاگردوں کو متنبہ کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ نئی تعلیم کے جوش میں اُس پرانی تعلیم کو جس میں اُنہوں نے نشوونما پائی ہے۔ بالکل نظر انداز کر دیں

---

[1] عبرانیوں ۱۲: ۱۶

کیونکہ یہ انسانی خاصہ ہے کہ جب وہ کسی نئے علم کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ اکثر اُس کا ثبوت پُرانی معلومات کی مذمت کرنے سے دیا کرتا ہے۔ چنانچہ خُداوند اپنے شاگردوں کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ جو پُرانی تعلیم کے جزئیات کے متعلق بھی مخالفانہ نکتۂ خیال رکھتے ہیں۔ اُن کو اس کی بادشاہت میں ادنےٰ درجہ دیا جائے گا لیکن اُن کو جو اُن پر تعظیم کے ساتھ غور کرتے ہیں۔ اعلےٰ مرتبہ عنایت ہوگا۔

(۲) اس کے بعد خُداوند سوال کے دوسرے پہلو پر غور کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ پُرانی شریعت ناقص و نامکمل تھی۔ لہذا نئی شریعت اُس پر فوقیت رکھتی ہے اور یہ فوقیت اوّل تو باعتبار اس معیار کے ہے جو اُس کے حامیان یعنی فقیہ اور فریسیوں کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ (آیت ۲۰) اور پھر باعتبار اُن اصولوں کے ہے جو اس شریعت میں مندرج ہیں۔ (آیات ۲۱۔ ۴۸)

اوّل۔ شریعت کے حامیوں کے اعتبار سے۔

"کیونکہ مَیں تم سے کہتا ہوں اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہوگے"۔

یہ بات آپ سے مخفی نہیں کہ فقیہہ اور فریسی کن خیالات کے معتقد تھے۔ اُنہوں نے اس تعلیم کو اور ان تمام باتوں کو جو عہدِ عتیق اور مُوسےٰ کی کتابوں میں بطور پیش خبری اور علامتوں کے پائی جاتی ہیں۔ بالکل فراموش کر رکھا تھا۔ اور اخلاقی پاکیزگی سے مُنہ موڑ کر ظاہری رسومات کی ادائیگی کو مذہب بنا رکھا تھا۔ لہذا چونکہ اُن

کا مذہب محض ظاہریات سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے ساکن اور غیر ترقی پذیر تھا۔ وہ ایک ایسا مذہب تھا جو چند مقررہ رسموں اور انتظاموں کے زور پر بغیر کسی قسم کی اخلاقی یا روحانی کوشش کے قائم رہ سکتا تھا۔ اس قسم کا مذہب اپنے پیروؤں میں خام خیالی اور ریاکاری پیدا کرتا ہے اسی لئے ہمارا خداوند ہمیشہ اُسے بُرا سمجھتا ہے اور یہاں اپنے شاگردوں کو آگاہ کرتا ہے کہ پُرانی شریعت کی نظر ثانی کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ ایک ایسا مذہب قائم کیا جائے گا جو فقیہوں اور فریسیوں کے مذہب سے زیادہ آسان ہوگا۔ بلکہ برعکس اس کے اُس میں اطاعت اور فرمانبرداری کا مطالبہ کیا جائے گا۔ جو عمیق اور پرکھنے والا ہوگا۔

لیکن ہمارا خداوند حامیان شریعت سے قطع نظر کرکے خود شریعت پر غور کرتا ہے اور پُرانی اخلاقی شریعت کا بدیں غرض مطالعہ کرتا ہے۔ کہ بتدریج اُسے اپنی نئی بادشاہت کی شریعت یا قانون بنالے۔

میں صرف دو باتوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں جو پُرانی شریعت کی ترمیم اور تصحیح سے علاقہ رکھتی ہیں۔

**اوّل** ۔ اُستاد کے اختیار کا ملاحظہ کیجئے۔ "تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا" کہ یہ کرنا اور وہ نہ کرنا وغیرہ اور ان باتوں کا کہنے والا خود خُدا تھا جو مُوسوی شریعت کے ذریعہ لوگوں سے خطاب کرتا تھا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں۔ کلام سنانے کا یہ ایک بالکل نرالا اور انوکھا طریقہ تھا۔ اور اس کی توجیہ صرف ایک ہی طرح

ہو سکتی ہے۔ تمام انبیا یہ کہا کرتے تھے۔ خداوند یوں فرماتا ہے گویا وہ محض پیغامبر تھے۔ لیکن الفاظ "میں تم سے کہتا ہوں"۔ بزور اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ مسیح نوعیت کے اعتبار سے باقی تمام کلام کرنے والوں سے مختلف اور ممتاز تھا۔ وہ دنیا کا اعلےٰ ترین متقنن تھا اور اختیار میں خُدا کا ہم پلہ تھا۔

دوم۔ ملاحظہ کیجئے کہ جب ہمارا خُداوند مختلف احکام کی تشریح کرتا ہے۔ تو ایسے اصولوں کو کام میں لاتا ہے۔ جن کا اطلاق تمام احکام پر یکساں ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ اُس اصول کو لے لیجئے جو خون یا زنا کے قانون کے بیان میں ظاہر ہوا تھا اور دیکھئے کہ اس کا اطلاق باقی تمام احکام پر ہو سکتا ہے یا نہیں[1]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا خُداوند چاہتا ہے کہ ہم دماغ سوزی اور اخلاقی غور و فکر کی عادت پیدا کریں اور تن آسانی اور سہل پسندی سے احتراز کریں۔

## شریعت متعلقہ قتل

"تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کر اور جو کوئی خون کرے گا۔ وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصہ ہو گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو اُس کو احمق کہیگا وہ آگ کے جہنم کا سزاوار ہو گا۔"

---

[1] اس کی تفصیل تتمہ نمبر ۱ صفحہ ۲۱۸ پر پائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا بیان کی تشریح کے لئے تواریخ کی دوسری کتاب کا مطالعہ کیجئے "اور اُس نے مملکت کے بیچ یہوداہ کے سارے حصین شہروں میں شہر بہ شہر قاضیوں کو مقرر کیا اور اُس نے قاضیوں کو کہا۔ کہ جو کچھ کرو۔ ہوشیاری سے کرو۔ کیونکہ تم آدمیوں کے لئے نہیں بلکہ خُدا کے لئے عدالت کرتے ہو جو کہ مقدمہ کے فیصل کرنے وقت تمہارے ساتھ ہے۔ پس خُداوند کا خوف تم پر ہووے کہ جو کچھ کرو سو خبرداری سے کرو۔ کیونکہ خُداوند ہمارے خُدا کے ساتھ ناانصافی نہیں۔ نہ کسی کی روداری ہے۔ نہ رشوت لینا ہے اور یروشلیم میں بھی یہوسفط نے لاویوں اور کاہنوں اور اسرائیل کے ابوی سرداروں کو مقرر کیا تاکہ وے خُداوند کی طرف سے عدالت کریں اور مقدمے فیصل کریں اور وے یروشلیم کو پھرے[1]"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہوسفط نے یروشلیم میں ایک عدالت اور دیگر شہروں میں مقامی عدالتیں قائم کی تھیں اور یہ انتظام مستقل انتظام تھا۔ پہاڑی وعظ کے اس بیان میں لفظ "عدالت" سے غالباً مقامی عدالتیں یا سن ہیڈرن (SANHEDRIN) مراد ہیں اور "صدر عدالت" کا مطلب مرکزی عدالت یا مرکزی سن ہیڈرن (SANHEDRIN) ہے کیونکہ ایک شدید جرائم کا فیصلہ عدالتیں بھی کر سکتی تھیں۔ لیکن شدید ترین جرائم صرف مرکزی عدالت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ غرضیکہ جرائم میں درجہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں یہودیوں کا خیال تھا کہ وہ جو غیر معمولی گناہوں کے

[1] تواریخ ۱۹: ۵-۸-

مرتکب ہوتے تھے۔ اُنہیں موت کے بعد نہایت ہی سخت اور شدید سزا ملتی تھی۔ گہینا (GEHENNA) یعنی وادی ہنوم جو یروشلیم کے قریب تھی۔ وہ جگہ تھی جہاں بچّے زندہ جلائے جاتے تھے۔ تاکہ مولک کے سامنے قربان کئے جائیں۔ بعد میں یہی نام استعارہ کے طور پر اس جگہ کو دیا گیا۔ جہاں موت کے بعد سزا ملے گی۔ لہٰذا یہودیوں کے نزدیک تین قسم کے قصور ہوا کرتے تھے۔ اوّل معمولی قصور۔ جن کا فیصلہ عدالتوں کے سپرد ہوتا تھا۔ دوم غیر معمولی قصور جو کہ مرکزی عدالت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ سوم بدترین قصور جنکی سزا موت کے بعد ملتی تھی۔

لیکن ہر ایک ایسا گناہ یا قصور۔ جس میں عمل یا فعلیّت نہ ہو۔ یہودی قانون کی دسترس سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ یہودی قانون کا تعلّق صرف ایسے جرائم سے تھا۔ جن میں کسی فعل کا ارتکاب ہو۔ مثلاً قتل وغیرہ۔ لیکن ہمارا خُداوند جرم کے معیار کو بلند کر دیتا ہے اور وہ فعلی گناہوں سے بالکل کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ گویا اُس کی بادشاہت کے شہریوں کا فعلی گناہوں سے کوئی تعلّق نہ تھا۔ قانون کے متعلّق اور بالخصوص قتل کے قانون کے متعلّق اُس کا نکتۂ خیال گویا حسب ذیل تھا۔ نئی شریعت کے ماتحت چاہیئے کہ تُم غصّہ اور نفرت کو جو تمہارے دلوں میں جاگزین ہو جاتے ہیں۔ اُسی نظر سے دیکھو۔ جس نظر سے پرانی شریعت کے ماننے والے قتل کو دیکھا کرتے تھے۔ بلکہ جب یہ دلی نفرت۔ عداوت اور حقارت کے الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے تو یہ اُس سے بھی بڑا قصور ہے اور اس کے ساتھ وہی اخلاقی گناہ وابستہ ہے۔ جس کے مرتکب کو پچھلے زمانے میں مرکزی عدالت کے سامنے حاضر ہونا پڑتا تھا۔

اور اپنے بھائی کو "احمق" کہنا تو ایسا گناہ ہے جس کی سزا ابدی ہلاکت ہو سکتی ہے۔ "وہ آگ کے جہنم کا سزاوار ہو گا"۔

اس میں شک نہیں کہ اس جگہ ہمارا خداوند ایک استعارہ استعمال کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کو اُس کے دل کے خیالات کے لئے عدالت میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ لیکن خداوند کا مطلب صاف ہے۔ وہ ہمارے گناہ آلود خیالات اور جذبات کو جنہیں ہم عمداً دل میں جگہ دیتے ہیں۔ اُسی سطح پر رکھتا ہے۔ جس پر گناہ آلود افعال اور اعمال کو رکھا گیا تھا۔ الفاظ کو وہ خیالات سے بھی بُرا جانتا ہے۔ لیکن نفرت اور عداوت کا اظہار کر کے کسی کی دل آزاری کرنا اُس کے نزدیک ایک ایسا بڑا گناہ ہے جو انسان کی رُوح کو برباد کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا طریق کے مطابق ہمارا خداوند چھٹے حکم کی تفسیر بھی کرتا ہے اور باقی احکام کی تفسیر بھی اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ایک جملہ معترضہ ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تمہارے درمیان کچھ کشیدگی یا رنجش ہے تو جلد اُسے دور کر کے آپس میں صلح کر لینی چاہیئے۔

"پس اگر تُو قربان گاہ پر اپنی نظر گزرانتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ شکایت ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے۔ اور جا کر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر تب آ کر اپنی نذر گزران۔ جب تک تُو اپنے مدعی کے ساتھ راہ میں ہے۔ اُس سے جلد صلح کر لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مدعی تجھے منصف کے حوالے کر دے۔ اور منصف تجھے سپاہی کے حوالے کر دے اور تُو قید خانے

میں ڈالا جائے۔ مَیں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک تو
کوڑی کوڑی ادا نہ کر دے گا۔ وہاں سے ہرگز نہ چھوٹے گا"

ہمارا خُداوند یہودیوں سے خطاب کر رہا ہے جو اپنی نذریں ہیکل میں عادی ہیں اور کہتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس مذہبی رسم کو ادا کر رہا ہے اور اُسے اچانک یاد آتا ہے کہ اُس کے بھائی کو اُس سے کچھ شکایت ہے تو چاہیے کہ وہ اُس نذر کو وہیں قربان گاہ پر چھوڑ دے۔ اور جلد جا کر اُس کام کو مکمل کرے۔ جسے اُس نے غیر مکمل چھوڑ رکھا ہے۔ یعنی اپنے بھائی سے صلح کر لے اور پھر آ کر اپنی نذر گزرانے۔ اس کام میں تعجیل کی تاکید کی جاتی ہے اور دوبارہ ہمارا خُداوند ایک اور استعارے کے ذریعہ اسی حقیقت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تمہیں کسی کا قرض ادا کرنا ہے تو تم ضرور جلدی کرو ورنہ قانون تم سے باز پرس کرے گا اور سزا دیگا۔ اسی طرح اخلاقی قصوروں کے متعلق بھی تعجیل سے کام لینا چاہیئے۔ اپنی ضمیر کو پاک کر کے آزاد کرنا چاہیئے ورنہ بُرے اخلاقی نتائج ظہور پذیر ہوں گے۔ اور انتہا درجہ کی روحانی کاوش کا سامنا کرنا پڑے گا۔

گو اس وقت خُداوند یہودیوں سے مخاطب ہے۔ لیکن اُس کا کلام مسیحیوں کے لئے بھی ہے اور وہ اپنی نئی بادشاہت کا قانون پیش کر رہا ہے۔ ہمارے پاس بھی ایک قربان گاہ ہے۔ جس پر ہم روحانی قربانیاں گذرانتے ہیں۔ اور یہ قربانیاں ہماری رُوح اور راستی کی عبادت ہیں۔ "بارہ رسولوں کی تعلیم"[1] میں آیا ہے۔ وہ شخص جس کی اپنے ساتھی کے ساتھ کچھ تکرار ہے تمہارے ساتھ شریک نہ ہو۔ جب تک کہ وہ اُس سے

---

[1] ڈیڈاجی ۱۴: ۲۔

ملاپ نہ کرلے۔ (وہی لفظ ہے جو متی ۵ : ۲۴ میں استعمال ہوا ہے)
"تاکہ تمہاری قربانی ناپاک نہ ہو جائے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس تعلیم پر پورے طور پر عامل ہوں کہ جو کوئی چیز ہم کو خُدا کی قربت سے روکتی ہے۔ اُسے جلد اپنے سے علیحدہ کریں۔ ہم انگریز لوگ اکثر اس بات پر فخر کیا کرتے ہیں کہ ہم ریاکار نہیں ہیں۔ ایک دفعہ مجھے کہا گیا اور یہ بات اب تک میرے ذہن نشین ہے کہ ہمارے زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ محصول لینے والے کی فریسیت کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ ہم میں سے اکثر کہا کرتے ہیں "مَیں پاک عشاء میں شامل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ شخص جسے دنیا میں رہ کر گزارہ کرنا ہے۔ اور دنیوی تعلقات کو نباہنا ہے اُسے خود ایسی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ جو مناسب نہیں اور دوسروں کی کئی ایک معیوب باتوں سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر مَیں پورے طور پر دیندار نہیں ہُوں تو کم از کم ریاکار بھی نہیں ہُوں" اس کی دعا کچھ اس قسم کی ہے۔ "اَے خُدا، مَیں تیرا شکر کرتا ہُوں کہ مَیں اِن ریاکاروں کی مانند نہیں ہُوں۔ مَیں ان کی طرح مذہبی دعوے نہیں کرتا" اس طبیعت کو مَیں محصول لینے والوں کی فریسیت کہتا ہُوں اور مذہبی دعوے نہ کرنے والوں کی فریسیت اسی قدر معیوب ہے۔ جس قدر ان کی جو کثرت سے ایسے دعوے کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا خُداوند یہ نہیں کہتا کہ اگر تم قربان گاہ کے پاس آنے کے لائق نہ ہو تو اُس سے دور رہو۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اپنے آپ کو اُس کے لائق بناؤ اور جلد بناؤ۔ "وہیں قربان گاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے" لیکن تم دیر تک اُس نذر کو وہاں چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ دوسروں کے کام میں حارج ہوگی۔

تم نے ایک کام کو نامکمل چھوڑا ہے۔ جلد واپس آکر اُسے مکمل کرو۔ اگر میرے قارئین میں بعض ایسے ہیں جو کلیسیا میں تو شامل ہیں لیکن پاک عشاء میں شریک نہیں ہیں لیکن مطمئن ہیں کیونکہ ریاکار نہیں ہیں۔ تو میں اُن سے عرض کروں گا کہ آپ کا یہ اطمینان غلط ہے۔ چاہیئے کہ آپ قربان گاہ کے پاس آنا شروع کریں اور اپنی بیوی یا شوہر۔ دوست یا پاسبان پر اس بات کو ظاہر کریں کہ آپ پاک عشاء میں شریک ہونا چاہتے ہیں اور کب ہونا چاہتے ہیں اور پھر جلد اُن اخلاقی نقائص کو دُور کریں جو اب تک سدّ راہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ ورنہ پھر مہلت نہ ملیگی اور آپ کو شدید اور زبردست اخلاقی نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس عبارت میں ایک اور نکتہ قابل غور ہے اور وہ لفظ "بھائی" کا استعمال ہے۔ بائبل میں یہ لفظ صرف اُنہیں پر عائد کیا گیا ہے جو عہد میں شامل ہیں۔ پُرانی شریعت میں یہ لفظ یہودیوں کے لئے اور نئی شریعت میں مسیحیوں کے لئے استعمال ہُوا ہے۔ لہذا ہمارا خُداوند یہاں مسیحیوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کر رہا ہے۔ جو خُدا کے باپ ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک اخوت میں سمجھتے ہیں یوں تو تمام بنی نوع انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لیکن ہمارا خُداوند اس جگہ صرف اُنہی کو مخاطب کر رہا ہے۔ جو سچ مچ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

## شریعت متعلقہ زناکاری

"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زِنا نہ کر۔ لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں

کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی۔
وہ دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا۔"

اس جگہ ہمارا خُداوند ایک نیا اُصول پیش کرتا ہے۔ چھٹے حکم کے متعلق وہ دشمنی کے احساس کو بھی گناہ تصوّر کرتا ہے۔ لیکن وہ اس احساس کے گناہ کو نہ صرف عمل کے گناہ سے بلکہ لفظ کے گناہ سے بھی ممتاز سمجھتا ہے۔ لیکن اس جگہ وہ دل کی خواہش کو بھی جب وہ گناہ کے ارادے تک پہنچ جاتی ہے۔ ارتکاب گناہ کے برابر خیال کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہمارا خُداوند ایسے شخص کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو اپنے دل میں گناہ کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ عورت کی طرف اس غرض[1] سے دیکھتا ہے کہ اُس کے شہوانی جذبات مشتعل ہوں۔ وہ عملی طور پر گناہ کا مرتکب تو نہیں ہوتا۔ کیونکہ موقع کی عدم موجودگی اور نتائج کا خوف مانع ہیں۔ لیکن وہ نیّت اور ارادہ میں گناہ کر چکا ہے۔ اس کے بعد ہمارا خُداوند بتلاتا ہے کہ اُس کی نظر میں گناہ کا ارادہ کرنا یا اپنے جذبات کو گناہ کے لئے مشتعل کرنا بھی گناہ ہے۔ گو گناہ کے عمل کا ارتکاب کا موقع نہ بھی ملے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کا اطلاق ساتویں حکم کے علاوہ باقی تمام احکام پر بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ہمارا خُداوند جنسی پاکیزگی کے متعلق چند ہدایات پیش کرتا ہے۔ جن کی رو سے انسان خود ضبطی سیکھ کر گناہ سے محفوظ رہ سکتا ہے

"پس اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال کر

---

[1] مقابلہ کرو ۶:۱ کے ساتھ۔ "آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لئے"۔ یہاں بھی وہی محاورہ ہے جو نیّت اور ارادہ پر دلالت کرتا ہے۔

اپنے پاس سے پھینک دے۔ کیونکہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے اور اگر تیرا دہنا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُس کو کاٹ کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے"۔

اس جگہ ہمارا خداوند ترک دُنیا یا خود ضبطی کے اہم اصول کو پیش کرتا ہے اور اُس کی تعلیم میں چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔

(۱) مکمل زندگی سے محفوظ زندگی بہتر ہے۔ ہماری فطرت کے تمام حِصص، خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ بہترین صورت تو یہ ہے کہ ہم ہی تمام قوتوں کو آزادی کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ لیکن مرکز کی محفوظ حالت محیط کی آزادی سے بہتر ہے۔ لہٰذا اگر ہم معلوم کریں کہ ہماری قوتوں میں کوئی قوت اس قدر بگڑ گئی ہے کہ ہماری زندگی کی بیخ کنی کر رہی ہے تو چاہیئے کہ ہم اُسی وقت اپنی تحدید کریں۔ کیونکہ محدود زندگی غیر محفوظ زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اُن چیزوں کو ترک کرنا چاہیئے جو ہمیں ناقابل برداشت آزمائشوں کا نشانہ بنادیں۔ بنگل (BENGEL) صاحب درست فرماتے ہیں۔ "دُنیا میں کثیر التعداد لوگ ایسے ہوئے ہیں۔ جن کی بربادی محض اس وجہ سے وقوع میں آئی کہ اُنہوں نے ایک عضو کی ہلاکت کو منظور نہ کیا"۔

یہ ایک ایسا اصول ہے۔ جس کا اطلاق بہ آسانی اُن معاملات پر ہو سکتا ہے جو اکثر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ کیا ناٹک کا تماشہ

دیکھنا جائز ہے ؟ کیا فلاں قسم کے فن سے لُطف اندوز ہونا یا فلاں شاخ ادبیات سے محفوظ ہونا مناسب اور درست ہے ؟ ایک حد تک ان سوالات کا جواب عام اُصولوں کی بنا پر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر عام طور پر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ فلاں ناٹک کا کھیل اچھا ہے۔ یا فلاں ادبی کتب و رسائل قابلِ مطالعہ ہیں یا فلاں قسم کا فن جائز ہے تو اس سے یہ نتیجہ تو مستنبط نہیں ہوتا کہ وہ سب کے سب میرے لئے بھی موزوں اور مناسب ہیں۔ یہ سوال دیگر ہے۔ میرے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھ پر اُن کا کیا اثر ہے ؟ کیا وہ میرے ادنےٰ جذبات کو مشتعل کرتے ہیں ؟ کیا وہ میرے لئے مخرب الاخلاق ہیں ؟ کیا وہ مجھے گناہ پر آمادہ کرتے ہیں ؟ اگر یہ درست ہے تو میرا کیا حق ہے۔ کہ میں عام وجوہات کی بنیاد پر اُن سے احتراز کرنے سے گریز کروں۔ بعض طبائع ایسی واقع ہوئی ہیں کہ وہ معقول سے معقول اور بے ضرر سے بے ضرر اشغال کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہیں اور اُن میں شریک ہونا اپنی ضمیر کے خلاف سمجھتی ہیں۔ یہ درحقیقت مختل نفسیات کے نمونے ہیں۔ چاہیئے کہ وہ جو عقل سلیم رکھتے ہیں ایسے لوگوں کی مدد کریں۔ لیکن اس وقت اس قسم کی حالتیں ہمارے مبحث میں داخل نہیں ہیں۔ ہمارے خُداوند کا اشارہ اخلاقی بے پروائی کی طرف ہے اور اس کی تنبیہہ بڑی سنجیدہ ہے۔ گو خُداوند کی یہ نصیحت استعارہ کے لباس میں ملبوس ہے۔ تاہم یہ استعارہ ایک زبردست حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ خُداوند کا ارشاد ہے کہ ایک محدود و مسدود زندگی بسر کرنا بہ نسبت اس کے کہ ہم تمام قوا رکھتے ہوئے اخلاقی ہلاکت

کے سزاوار ٹھہریں بدرجہا بہتر ہے۔

(۲) اس جگہ مسیحی راہبانیت کا اصول بھی بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بہت سے ایسے راہب ملیں گے جنہوں نے اس بنا پر فقیرانہ زندگی کو اختیار کیا ہے کہ جسم فی نفسہٖ ایک بُری چیز ہے اور کہ روحانی مزاج ہونے کے لئے مادی اشیا سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔ مسیحی تصور جو اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ ہے کہ مادّہ بمعہ انسانی جسم کے فی ذاتہ ایک اچھی چیز ہے اور وہ روحانی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ لہٰذا ہرگز کسی قوت کو اس خیال سے کہ وہ بُری ہے اور اُس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہیئے۔ مارنا نہ چاہیئے۔ مسیحی تصور کے مطابق خود ضبطی اور اصلاحِ جسم کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری تمام فطرت کو آزادی حاصل ہو۔ لیکن آزادی صرف وہاں ممکن ہے۔ جہاں عقل کی قیود پائی جائیں لہٰذا قربانی صرف اس حالت میں جائز ہے جب ہماری فطرت کے ادنےٰ پہلو اعلےٰ پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہیں۔

اسی ساتویں حکم کے سلسلہ میں ہمارا خُداوند مسئلہ طلاق پر بھی بحث کرتا ہے۔

"یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔ وہ اُسے طلاق نامہ لکھ دے۔ لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اُس سے زنا کراتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔"

طلاق کا یہودی قانون استثنا ۲۴: ۱ و ۲ میں مندرج ہے:-

"اگر کوئی مرد کسی عورت سے بیاہ کرے اور پیچھے اُس میں کوئی ایسی بیہودہ بات پائے۔ جس سے عورت کی طرف اُس کی التفات نہ رہے تو وہ اُس کا طلاق نامہ لکھ کر اُس کے حوالہ کرے اور اُسے اپنے گھر سے نکال دے اور جب وہ اُس کے گھر سے نکل جائے تو وہ دوسرے مرد کی ہو سکتی ہے۔"

یہودی روایات کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس قانون نے طلاق کے متعلق یہودیوں کو ایک ایسی آزادی دے رکھی تھی جو بہت خطرناک ثابت ہوئی۔ لہذا ہمارا خُداوند اُس آزادی کو دور باکم کیا چاہتا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق خُداوند کا فیصلہ متی ۱۹: ۳-۹ میں پایا جاتا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

"اور فریسی اُسے آزمانے کے واسطے اُس کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ کیا ہر ایک سبب سے اپنی بیوی کا چھوڑ دینا روا ہے؟ اُس نے جواب میں کہا۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ جس نے اُنہیں بنایا۔ اُس نے ابتدا ہی سے اُنہیں مرد اور عورت بنا کر کہا کہ اس سبب سے مرد باپ سے اور ماں سے جُدا ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ رہے گا اور وہ دونوں ایک جسم ہونگے؟ پس وہ دو نہیں۔ بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جسے خُدا نے جوڑا ہے۔ اُسے آدمی جُدا نہ کرے۔ اُنہوں نے اُس سے کہا پھر موسےٰ نے کیوں حکم دیا ہے کہ طلاق نامہ دے کر اُسے چھوڑ دے؟ اُس نے اُن سے کہا کہ موسےٰ نے تمہاری سخت دلی کے سبب تمہیں اپنی بیویوں کو چھوڑ دینے کی اجازت دی

مگر ابتدا سے ایسا نہ تھا اور مَیں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی
اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے
اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی
ہوئی سے بیاہ کرلے وہ بھی زنا کرتا ہے"۔

یہ دونو مقامات ایک مستثنا حالت کو چھوڑ کر یک زبان ہو کر بتلاتے ہیں کہ ہمارے خُداوند کا فیصلہ یہ ہے اور یہی اُس کی نئی بادشاہت کا قانون ہے کہ بیاہ ایک ایسا رشتہ ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو سکتا اور ہم مسیحیوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا بھر کے بادشاہ اور پارلیمنٹیں ہمارے خُداوند کے قانون کو تبدیل نہیں کر سکتے اور اگر مسیح کے کوئی خادم یا کوئی اور اشخاص جو مسیح کی کلیسیا کی نمائندگی کے مدعی ہوں۔ کبھی انسان کے احکام کو خواہ وہ کتنے ہی اعلےٰ مراتب پر کیوں نہ ہوں۔ مسیح خُداوند کے احکام پر فوقیت دینے کی جرأت کرتے ہیں۔ اُن کے متعلق خُداوند کا یہ فرمان درست ہے کہ "جو کوئی اس زناکار اور خطاکار قوم میں مُجھ سے اور میری باتوں سے شرمائے گا۔ ابن آدم بھی جب اپنے باپ کے جلال میں پاک فرشتوں کے ساتھ آئے گا تو اُس سے شرمائے گا"[1]۔ بلاشبہ کلیسیا اور اُن سب کے لئے جو اپنے آپ کو مسیحی کہتے ہیں ان اشخاص کے بیاہ کو بیاہ تسلیم کرنا ناممکن ہے جو طلاق کے بعد پھر مسیح کی شریعت کے برخلاف ایک دوسرے کے حین حیات میں نکاح کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی نکاح کا فسخ نہ ہونا بعض مستثنا حالات میں بہت شاق گزرتا ہے۔ لیکن یہ بات تمام قوانین کے متعلق درست

---

[1] مرقس ۸: ۳۸۔

ہے جو انسان کے فائدے کے لئے مرتب کئے جاتے ہیں۔ خواہ یہ قانون گراں ہو یا ہلکا۔ لیکن نہایت صاف اور واضح صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ عام طور پر ہمارے خداوند نے جزئیات کے متعلق قوانین مقرر کرنے سے احتراز کیا ہے لیکن اس ایک معاملہ میں اپنے معمول کے خلاف کیا ہے اور اب ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا ہم مسیح کے حکم اور اختیار کو باقی تمام احکام اور اختیارات پر ترجیح دیں گے یا نہیں ؟

لیکن دوسری بات یہ ہے کہ خداوند ان دونوں حوالجات میں ایک مستثنا حالت کا ذکر کرتا ہے اور یہ مستثنا حالت ایک بے قصور شخص کے جس نے اپنی بیوی کو زنا کی وجہ سے علیحدہ کیا ہے دوبارہ بیاہ کر لینے میں مانع نہیں ہے۔

بہت کوششیں کی گئی ہیں۔ کہ اس استثنا کے دائرہ کو حد سے زیادہ وسیع کر دیا جائے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک وہ بالکل ناتمام ثابت ہوئی ہیں[1]۔ مثلاً ایک دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ لوقا کی انجیل اور پولوس کے خطوط میں جہاں بیاہ کا بیان ہے وہاں اس استثنا کا مطلق ذکر نہیں آیا۔ لیکن قواعد تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم جس میں توصیفی اور تفصیلی شرائط پائی جائیں ایک عام اور بلا تفصیل حکم کی نسبت زیادہ صحیح اور قابل التفات سمجھا جائے گا۔ اور کہ اوّل الذکر موخر الذکر کی تشریح اور تفسیر

---

[1] دیکھو تتمہ نمبر ۳۔ صفحہ ۲۲۷۔ طلاق کی نسبت کلیسیا کا فرض۔

کرے گا۔[1] ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ غیر منقسم کلیسیا میں اس مسئلہ کے متعلق بہت اختلاف پایا جاتا تھا۔ مشرقی کلیسیا میں فریقین میں سے بے قصور فریق کو دوبارہ بیاہ کرنے کی اجازت تھی۔ گو مغربی کلیسیا اور کلیسیائے انگلستان نے مطلقاً اس خیال کے ساتھ اتفاق نہ کیا۔ تو بھی انگریزی کلیسیا کے بشپوں نے لیمبتھ (LAMBETH) کی مجلس منعقدہ ۱۸۸۸ء میں اس کے متعلق اپنا اظہار رضامندی کیا اور ذیل کی قراردادیں منظور کیں۔

۱۔ چونکہ ہمارے خداوند نے سوا زنا یا حرامکاری کی حالت کے طلاق کی اجازت نہیں دی ہے۔ لہذا مسیحی کلیسیا نہ تو طلاق کو سوا مذکورہ بالا مستثنا حالت کے کسی اور حالت میں تسلیم کر سکتی ہے اور نہ ہی فریق ثانی کے حین حیات میں کسی ایسے شخص کے بیاہ کی اجازت دے سکتی ہے۔ جو مسیح کے قانون کے برخلاف مطلق ہوا ہو۔

۲۔ طلاق بہ باعث زنا کی حالت میں قصوروار فریق بے قصور فریق کے حین حیات میں ہرگز نکاح ثانی کا اہل اور کلیسیا کی برکتوں کا مستحق نہ سمجھا جائے گا۔

۳۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اس مسئلہ کے متعلق کہ آیا ہمارے خداوند نے طلاق بہ باعث زنا کی حالت میں بے قصور فریق کو بیاہ کرنے کی اجازت دی ہے یا نہیں۔ کلیسیا میں اختلاف رائے

---

[1] پولوس کے خطوط میں ایک جگہ جہاں بیاہ کے ناقابل فسخ ہونے کا قانون مرقوم ہے (رومیوں ۷: ۱-۳) وہاں رسول یہودی شریعت کا ذکر کر رہا ہے (آیت ۱) جس میں بلاشبہ مستثنیات کی گنجائش تھی۔ لیکن تو بھی پولوس اس کا بیان نہیں کرتا۔

ہا ہے۔ کانفرنس ہذا سفارش کرتی ہے کہ خادمان دین کو ہدایت کی جائے کہ وہ ایسے اشخاص کو پاک عشاء کی شراکت اور دیگر کلیسیائی برکتوں سے محروم نہ رکھیں۔ جنہوں نے عدالت کی اجازت سے مذکورہ بالا حالات میں شادی کی ہو۔

میں نے صرف متی کی انجیل کی تشریح پر بحث کی ہے۔ انگریزی کلیسیا کے خادمان دین کے موجودہ فرائض کا براہِ راست ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن آج طلاق کے مسئلہ سے زیادہ اور کوئی مسئلہ کلیسیائے انگلستان کے سکون و اطمینان پر حملہ آور نہیں ہو رہا۔ میری ناقص رائے میں ہم ذیل کے طریق پر اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ کلیسیائے انگلستان کا غیر تبدیل شدہ قانون جو ملکی قانون سے بالکل ممتاز ہے۔ بیاہ کے متعلق مستثنیات کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اصحاب جو متی کے مقامات کی مذکورہ بالا تفسیر سے متفق ہیں۔ ضرور تسلیم کر لیں گے کہ اگر انگلستان کے کلیسیائی قانون میں لیمبتھ (LAMBETH) کے فیصلوں کے مطابق ترمیم کر دی جائے تو مسیح کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ لیکن تا ہنوز اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لہذا جیسا وہ ہے۔ ہمارے عمل کے لئے سند ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں موجودہ خیالات اور اقتصادی تجربات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے کہ قصوروار اور بے قصور فریق میں امتیاز کرنا کس قدر مشکل ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس قانون میں کلیسیائی فیصلہ کے ذریعہ کوئی ردوبدل نہ کیا جائے۔ بلکہ میری رائے میں بہترین صورت یہ ہے کہ کلیسیا کے قانون کو قائم رکھا جائے اور طلاق

بہ باعث زنا کے بعد بے قصور فریق کو بھی کلیسیائی رسوم کے ساتھ اور کلیسیائی مخصوص عمارتوں میں نکاح ثانی کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن باوجود اس کے بشپ صاحبان کو اختیار ہوگا کہ وہ لیمبتھ (LAMBETH) کانفرنس کی سفارش کی دفعہ ۳ پر کاربند ہوتے ہوئے اپنے خادمان دین کو ہدایت دیں کہ وہ ایسے "بے قصور" اشخاص کو پاک عشاء میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ جن کا عدالتی طور پر نکاح ثانی ہو چکا ہو۔

## شریعت متعلقہ قسم

"پھر تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھا۔ بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لئے پوری کر۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا۔ نہ تو آسمان کی۔ کیونکہ وہ خدا کا تخت ہے۔ نہ زمین کی۔ کیونکہ وہ اس کے پاؤں کے نیچے کی چوکی ہے۔ نہ یروشلیم کی۔ کیونکہ وہ بزرگ بادشاہ کا شہر ہے نہ اپنے سر کی قسم کھانا۔ کیونکہ تو ایک بال بھی سفید یا کالا نہیں کر سکتا۔ بلکہ تمہارا کلام ہاں ہاں یا نہیں نہیں ہو۔ کیونکہ جو اس سے زیادہ ہے۔ وہ بدی سے ہے۔"

اگر تیسرے حکم کا عہد عتیق کے دیگر مقامات[۱] کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنی اسرائیل کو صرف خدا کے نام پر قسم کھانے کی اجازت تھی۔ اور انہیں تاکید تھی کہ وہ اپنی قسموں کو پورا کریں۔ ہمارا خداوند اس ہدایت کی تائید[۲] کرتا ہے۔ اور اس پس منظر

---

[۱] احبار ۱۹: ۱۲ + استثنا ۶: ۱۳ + عاموس ۸: ۱۴ + [۲] متی ۲۳: ۱۶-۲۰۔

سمجھنے داخل کرتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قسم کی ماہیّت کیا ہے؟ قسم کھانا اپنے آپ کو کمال سنجیدگی کے ساتھ خُدا کے حضور میں پیش کر کے یہ کہنا ہے کہ جس طرح خُدا کا وجود ایک حقیقت ہے اور جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ مَیں اپنی زندگی میں اُس کی برکتوں کا اُمیدوار ہُوں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ جو کچھ اس وقت کہہ رہا ہُوں وہ سچ ہے۔ قسم میں اصل بات یہ ہے کہ ہم کبھی کبھی خاص خاص موقعوں پر اپنے آپ کو سنجیدگی کے ساتھ خُدا کی حضوری میں کھڑا کرتے ہیں۔ لیکن کیا خُدا ہر جگہ حاضر نہیں ہے؟ کیا ہم کبھی بھی اُس کی حضوری سے باہر ہیں؟ کیا تمام زندگی کا انحصار اُس کی زندگی اور اُس کی مرضی پر نہیں ہے؟ پس جبکہ خُدا ہمہ جا موجود اور تمام زندگی کا منبع اور مصدر ہے تو محض خاص خاص اوقات پر اپنے آپ کو اُس کی حضوری میں سمجھنے کے کیا معنی ہیں؟ ہمارا خُداوند خُدا کے ہمہ جا موجود اور قادرِ مطلق ہونے کی حقیقت کی طرف انسان کی توجّہ منعطف کرانا چاہتا ہے۔ اور اس یہودی قانون کو اس درجہ وسیع کرنا چاہتا ہے کہ تمام انسانی گفتگو اور بول چال اُس کی نئی بادشاہت میں اُس بلند سطح پر آجائے۔ جہاں پہلے صرف قسمیہ قول و قرار ہوا کرتے تھے۔ یہودیوں کی نظر میں قسم کو توڑنا نہایت ہی معیوب تھا۔ لیکن عام گفتگو میں دروغ گوئی کرنا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہمارا خُداوند کہتا ہے کہ خُدا ہر جگہ ہے اور ہر ایک بات اُس کی حضوری میں کہی جاتی ہے۔ لہٰذا راست گفتاری ہر وقت لازمی اور ضروری ہے۔ تمہاری ہاں ہمیشہ ہاں ہونی چاہیے

اور تمہاری نہیں ہمیشہ نہیں ہونی چاہیئے۔

نہ صرف یعقوب رسول اپنے خط میں[1] خداوند کی اس نصیحت کو دُہراتا ہے۔ بلکہ وہ رنج و افسوس جو پولوس[2] رسول کو یہ سُن کر ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس پر وعدہ خلافی اور دروغ گوئی کا الزام لگاتے ہیں۔ خود مسیح کے اس فرمان کی ایک نصیحت آموز تفسیر ہے۔ راست گفتاری ہر جگہ مسیحیوں کا خصوصی نشان ہونا چاہیئے۔ کبھی "ہاں" اور کبھی "نہیں" کا وطیرہ بالکل مسیحیت کے خلاف ہے۔ اگر مسیحی جماعت میں باہمی اعتماد اور بھروسہ نہ ہو تو ہر قسم کی اقتصادی ترقی مسدود ہو جائے گی۔ اُن جماعتوں کی جنہیں ہم مزدوری پیشہ لوگ کہتے ہیں (یہ اصطلاح اپنے اندر ایسے محدود معنی رکھتی ہے۔ جو نہ تو اُن کے لئے مفید ہیں جو اس نام کے دائرے کے اندر ہیں اور نہ ہی اُن کے لئے جو باہر ہیں) موجودہ تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اس ضمن میں ذیل کی تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔

(۱) راست گفتاری کا فرض خُداوند کی تفسیر کے مطابق تیسرے حکم کے تحت میں آتا ہے۔ عام طور پر مسیحی لوگ جب دس احکام کی روشنی میں اپنی اخلاقی زندگی کا معائنہ کیا چاہتے ہیں تو وہ سچ بولنے کے فرض کو نویں حکم کے تحت میں رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے خُداوند کے الفاظ کے اعتبار سے یہ غلط ہے اور یہ غلطی ایک اساسی نقص پر مبنی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم اُسی جھوٹ کو گناہ سمجھتے ہیں۔ جس سے کسی کو

---

[1] ۵: ۱۲۔ [2] ۲ کرنتھی ۱: ۱۷ و ۱۸۔

نقصان پہنچے۔ یا اُس کی نیک نامی پر دھبہ لگے۔ لیکن ہمارا خُداوند ہر قسم کی دروغ گوئی کو تیسرے حکم کے وسیع دائرے کے تحت میں لا کر اُسے گناہ ثابت کرتا ہے اور اُس سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔

(۲) گو ہمارا خُداوند خُدا کی ہمہ جا موجودگی کی تعلیم دیتا ہے تاہم وہ اس کے مختلف مدارج کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اکثر جب ہم گرجاگھر اور پاک عشائیں خُدا کی خاص حضوری کا دعوے کرتے ہیں۔ تو لوگ یہ اعتراض اٹھایا کرتے ہیں کہ کیا خُدا ہر جگہ حاضر نہیں ہے؟ ہاں آسمان خُدا کا تخت ہے۔ زمین اُس کے پاؤں کی چوکی اور یروشلیم اُس کا شہر ہے[1]۔ چونکہ خُدا کی حضوری جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ اس لئے اس میں مدارج کی گنجائش ہے۔ خُدا ہر جگہ حاضر ہے۔ لیکن جہاں دو یا تین جمع ہیں۔ وہاں وہ خاص معنی میں اور خاص مقصد کے ساتھ حاضر ہے اسی طرح وہ خاص طور پر اور خاص مقصد سے اپنے پُر فضل اور پاک ساکرامنٹوں میں حاضر ہوتا ہے۔ علےٰ ہذا القیاس ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے عقل ہستیوں کی نسبت ذی عقل ہستیوں میں اور بُرے آدمیوں کی نسبت نیک آدمیوں میں زیادہ موجود رہتا ہے۔

(۳) ہمیں اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔ کیا مسیحی کے لئے قسم کھانے کی قطعاً ممانعت ہے؟ کیا مسیحی کا عدالت میں قسم کھانا ناجائز ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ سردار کاہن خود ہمارے خُداوند کو قسم دیتا ہے اور کہتا ہے مَیں تجھے زندہ خُداوند کی قسم دیتا ہوں

---

[1] یسعیاہ ۶۶: ۱ + زبور ۴۸: ۲۔

کہ اگر تو ..... لیکن خداوند اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ سردار کاہن کے سوال کا جواب دیتا ہے[1]۔ پولوس رسول تین یا چار مختلف موقعوں پر خدا کو گواہ مقرر کر کے بات کرتا ہے اور اپنی راست گفتاری کی تصدیق کرواتا ہے۔ ان نظیروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ مسیحیوں کا عدالت میں قسم کھانا ناجائز نہیں ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ جب کسی مسیحی کو عدالت میں قسم کھانا پڑے تو اُسے محض اس خیال سے ایسا کرنا چاہیئے۔ کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اُسے سچ سے محبت ہے اور یہی بات اُس کی عام گفتگو میں بھی نظر آنی چاہیئے۔ لیکن باوجود اس کے اُس کا قسم کھانا اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ انسان اپنی معمولی بات چیت میں سچ نہیں بولا کرتے۔ اس صورت میں قسم کھانا جائز نہیں ہے اور وہ شخص جو یہ خیال کرے کہ قسم کے بغیر اپنی بات پر قائم رہنا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ مسیحی معیار سے بہت نیچے گرا ہوا ہے لیکن جب مسیحی ممالک ہی کے بارے میں کہا جائے۔ کہ اُن کی قانونی عدالتوں میں جھوٹی گواہی عام طور پر رائج ہے تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟

---

[1] متی ۲۶: ۶۳۔

# باب پنجم

## پُرانی شریعت کی نظرثانی (جاری)

دس احکام میں سے پہلے تین پر بحث کرنے کے بعد ہمارا خُداوند پرانے عہد کے دو اور تصورات پر غور کرتا ہے۔ اور وہ اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتا ہے جو اُس نے احکام عشرہ کے پہلے تین حکموں کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ اُن کے عمق اور وسعت کو بڑھاتا ہے اور اُن میں نئے معانی داخل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس معیار تک پہنچ جاتے ہیں کہ اُس کی پاک اور کامل عقل کو پسند آتے ہیں۔ ہر دو حالات میں ہمارے خُداوند کی تنقید غایت درجہ کی دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔

### شریعت متعلّقہ انتقام

"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتہ لینا چاہے۔ تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں

لے جائے۔ اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی
تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو تجھ سے قرض
چاہے اُس سے مُنہ نہ موڑ۔"

اس جگہ ہمارا خُداوند شریعتِ قدیم کے ایک خاص مسئلہ پر غور کر رہا ہے۔ مُوسوی شریعت انتقام کی ایک حد تک اجازت دیتی ہے۔ لیکن اُس کے بعد نہیں۔ وہ انتقام میں برابری اور مساوات کی معتقد ہے۔ چنانچہ خروج ۲۱: ۲۴ و ۲۵ میں مرقوم ہے۔ اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔ دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ۔ پاؤں کے بدلے پاؤں۔ جلانے کے بدلے جلانا۔ زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔"

۱۔ پہلی بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ قدیمی شریعت انسانی جبلت کی تخدید کرتی ہے۔ ایک وحشی کی انتقامی جبلت کا تقاضا یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ دست بگریباں ہو جائے اور حتی الوسع نقصان پہنچائے۔ وہ انتقام لے کر لطف اندوز ہوتا ہے اور جب تک اپنے حریف اور اُس کے خاندان کو ہلاک نہ کر لے چین نہیں لیتا۔ عہدِ قدیم کی سب سے زیادہ توجہ طلب خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی وحشیانہ عادات کو قابو اور ضبط میں لایا چاہتا ہے۔ یہی بات جانوروں کی قربانی میں نظر آتی ہے اور یہی بات انتقام کی شریعت میں دکھائی دیتی ہے۔ مُوسوی شریعت گویا پولیس کے سپاہی کی مانند ہے اور کہتی ہے کہ نقصان کتنا ہوا ہے؟ ایک آنکھ گئی ہے؟ اچھا۔ تو اس کے عوض میں ایک آنکھ نکالی جا سکتی ہے۔ لیکن

اس سے زیادہ نہیں۔ اس پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ قابل لحاظ بات اس جگہ یہ ہے کہ شریعت قدیم نے فوری مدافعت کے بجائے تدریجی تجدید کا طریقہ استعمال کیا۔ یا یوں کہیں کہ خدا انسان کی اصلاح بتدریج کرتا ہے۔ عہد عتیق میں اُن کے جذبات کو آہستہ آہستہ مقید و محدود کرتا ہے اور انہیں اُس وقت کے لئے تیار کرتا ہے۔ جبکہ وہ ابن آدم کی کامل تادیب و تنظیم کے ماتحت آجائیں گے۔ چنانچہ اب جب کہ وقت پورا ہو جاتا ہے۔ تو ہمارا خداوند انتقام کی جبلت سے ایک نہایت ہی زبردست تقاضا کرتا ہے اور اپنے ہر ایک شاگرد سے کہتا ہے کہ جب کبھی تمہیں شخصی طور پر کوئی نقصان پہنچایا جائے۔ تو اُس سے طبیعت کو مکدر نہ ہونے دو۔ بلکہ یہ ثابت کرو کہ تم ہر قسم کے شخصی رنج پر قادر اور ہر تکلیف پر حاوی ہو۔ ہمارا خداوند انتقام میں اعتدال نہیں۔ بلکہ کامل خود فراموشی طلب کرتا ہے۔

۲۔ دوسری بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یہ خود فراموشی اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے ایک راہبانہ مطالبہ پیش کرتی ہے۔ جو ہمارے خداوند کے اُس فرمان سے مشابہت رکھتا ہے کہ "اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے ... اور اگر تیرا دہنا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُس کو کاٹ کر اپنے پاس سے پھینک دے۔" نفس کی اس قطع و برید کی ضرورت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسانی اعضاء و قواء اس درجہ تک بدی کے قبضہ میں رہے ہیں کہ پیشتر اس سے کہ وہ دوبارہ نیک کاموں میں استعمال کئے جا سکیں۔ ضرور ہے کہ وہ اس

خود فراموشی کی سخت تادیب کے ماتحت رہیں۔

یہی بات انتقام کی جبلّت کے متعلق بھی درست ہے۔ انتقام کی جبلت میں کچھ نہ کچھ حقیقت اور معقولیّت ضرور ہے۔ کیونکہ اس میں عدل کا تقاضا پایا جاتا ہے اور یہ تقاضا انسان میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اگر کوئی کسی کو نقصان پہنچائے تو اُسے اُس کی پاداش کے لئے بھی تیار ہونا چاہیئے۔ عدل اوصافِ الٰہی میں سے ایک وصف ہے جو انسان کے اندر بھی رکھا گیا ہے۔ لیکن جب ہمارا اپنا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو ہم اکثر انصاف کے اصول کو فراموش کر کے خودی اور خودغرضی سے کام لیتے ہیں اور ایسے ایسے زبردست مطالبات کیا کرتے ہیں کہ انصاف اور حق پسندی کا خون ہو جاتا ہے۔ اور وہ تقاضائے عدل سراسر گناہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہمارا خُداوند انتقام کو ایک ناپاک جذبہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے "انتقام لینا میرا کام ہے۔ بدلہ مَیں ہی دوں گا" وہ ہم سے ہمارے نجی کے معاملات میں انصاف کرنے کا حق ہم سے لے لیتا ہے "کیونکہ انسان کا غصہ خُدا کی راستبازی کا کام نہیں کرتا" اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ہم انفرادی طور پر خود فراموشی کے اصول پر عامل ہوں۔

۳۔ وہ مطالبات جو ہمارا خُداوند اپنے شاگردوں سے کرتا ہے وہ محض زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ وہ اُنہیں اپنی زندگی کے تجربات کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ اگر آپ اُس کے صلیبی دُکھوں پر تفصیلی نظر ڈالیں اور اُس کے تلخ تجربات کا صحیح طور پر مطالعہ کریں تو آپ دیکھینگے کہ اُن میں سے کئی ایسے ہیں جو بالکل ناقابل برداشت ہیں۔ ہمارے

تصور میں اتنی طاقت نہیں کہ ہم اُن زخموں کا اندازہ لگا سکیں جو انسانی ظلم و تعدی کے تیروں سے لگا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اس واقعہ پر غور کیجئے۔ جبکہ خُداوند کے دشمن اُس پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں لیکن ایسی عیاری اور چالاکی کے ساتھ کہ اُن میں سچائی کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے[1] "پھر بعض نے اُٹھ کر اُس پر یہ جھوٹی گواہی دی کہ ہم نے اُسے یہ کہتے سُنا ہے کہ میں اس مقدس کو جو ہاتھ سے بنا ہے ڈھاؤں گا اور تین دن میں دوسرا بناؤں گا جو ہاتھ سے نہ بنا ہو"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خُداوند نے اس سے ملتی جلتی ہوئی کوئی بات کہی تھی۔ لیکن ہو بہو یہ بات نہ تھی۔ اُس نے یہ کہا تھا۔ "اس مقدس کو ڈھا دو تو میں اسے تین دن میں کھڑا کر دوں گا"۔ یعنی اگر تم اُسے گرا دو گے تو میں کھڑا کر دوں گا۔ ہمارے خُداوند کے اپنے الفاظ میں اور ان الفاظ میں جو زبردستی اُس کے ذمہ لگائے گئے آسمان زمین کا فرق تھا۔ لیکن عوام جزئیات کی صحت کا لحاظ نہیں کیا کرتے۔ وہ چند الفاظ کو سُن کر نتیجہ نکال لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس حالت میں بھی ایسا ہی کیا گیا اور عام لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ یسوع نے ضرور کچھ ایسی بات کہی ہو گی اور اگر وہ اپنی برّیت کی کوشش کرے گا۔ تو اُسے بہت سی لفظی تکرار کرنی پڑے گی۔ لہٰذا وہ عدالت میں پہنچ جاتے ہیں اور ملزم پر مُن گھڑت الزامات لگاتے ہیں۔ اس جگہ ہمارے خُداوند کی پاسبانی جبلت کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بہت سے لوگ اُسے دیکھ رہے ہیں اور دل میں فیصلہ کیا چاہتے ہیں کہ آیا وہ

---

[1] غالباً اس خیال کا ماخذ ڈین آف چیچسٹر (DEAN OF CHICHESTER) کا ایک درس ہے۔ ۲ مرقس ۱۴: ۵۷-۵۸۔ ۳ یوحنا ۲: ۱۹

حقیقی مسیح ہے یا نہیں۔ ایک الزام اُس پر لگایا جاتا ہے جو صداقت کی شکل رکھتا ہے۔ لیکن صداقت نہیں ہے تو بھی اُس کی وجہ سے لوگوں میں اُس کے خلاف نفرت اور عداوت پھیل جاتی ہے۔ یہ اُس کی رُوح کے لئے ایک زبردست اذیت ہے اور اگر ہم ذرا بھی اپنی قوت متخیلہ سے کام لیں تو ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت ہمارے خُداوند کو نہ صرف لوگوں کے طعن و تشنیع بلکہ اُنکی بے انصافی کے باعث کیا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن باوجود اس کے نہ وہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا اور نہ دُکھ پا کر کسی کو دھمکاتا تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو سچے انصاف کرنے والے کے سپرد کرتا تھا۔[1]"

۴۔ جب ہمارے شخصی جذبات پورے طور پر قابو میں آجائینگے تب ممکن ہے کہ عدل اور انتظامات کے برقرار رکھنے کے فرائض دوبارہ ہماری توجہ کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ ہمارا خُداوند ایک اور جگہ فرماتا[2] ہے جو سرسری نظر میں اس موجودہ فرمان کے متناقض معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ "اگر تیرا بھائی تیرا گناہ کرے"..... تو کیا اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے؟ نہیں۔ بلکہ "تُو جا اور اکیلے میں بات چیت کر کے اُسے سمجھا۔ اگر وہ تیری سُنے تو تُو نے اپنے بھائی کو پالیا اور اگر نہ سُنے تو اور ایک دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جا۔ تاکہ ہر ایک بات دو تین گواہوں کی زبان سے ثابت ہو جائے۔ اگر وہ اُن کی بھی سُننے سے انکار کرے تو کلیسیا سے کہہ اور اگر کلیسیا کی بھی سُننے سے انکار کرے۔ تو تُو اُسے غیر قوم والے اور محصول لینے والے کے برابر جان"۔

---

[1] ۱ پطرس ۲: ۲۳۔ [2] متی ۱۸: ۱۵۔

یہاں ہمارا خداوند انتہا درجہ کی شخصی حلیمی کی تاکید نہیں کرتا - بلکہ اقتصادی عدالت پر اصرار کرتا ہے اور وہ خود اپنے مقدمہ میں بھی ایک موقع پر انصاف کی درخواست کرتا ہے۔ "جب اُس نے یہ کہا تو پیادوں میں سے ایک شخص نے جو پاس کھڑا تھا۔ یسوع کے طمانچہ مار کے کہا تو سردار کاہن کو ایسا جواب دیتا ہے؟ یسوع نے اُسے جواب دیا کہ اگر مَیں نے بُرا کہا تو اُس بُرائی پر گواہی دے اور اگر اچھا کہا تو مجھے مارتا کیوں ہے"[۱]؟ اسی طرح پولوس بھی رسولوں کے اعمال میں انصاف طلب کرتا ہے۔ "مَیں قیصر کے تختِ عدالت کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرا مقدمہ یہیں فیصل ہونا چاہیئے۔ یہودیوں کا مَیں نے کچھ قصور نہیں کیا۔ چنانچہ تُو بھی خوب جانتا ہے۔ اگر بدکار ہوں یا مَیں نے قتل کے لائق کوئی کام کیا ہے تو مجھے مرنے سے انکار نہیں۔ لیکن جن باتوں کا وہ مجھ پر الزام لگاتے ہیں اگر اُن کی کچھ اصل نہیں تو اُن کی رعایت سے کوئی مجھ کو اُن کے حوالے نہیں کر سکتا۔ مَیں قیصر کے ہاں اپیل کرتا ہوں"[۲]۔

ہمارے سامنے دو فرائض ہیں جو بظاہر متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا فرض شخصی جذبات کے نکتۂ خیال سے خود فراموشی ہے۔ لیکن جب ہم نے اپنی مرضیوں کو پورے طور پر خُدا کی مرضی کے تابع کر لیا اور انتقام کی جبلّت کو مغلوب کر لیا۔ تب ہم دوسرے فرض کی ادائیگی کے اہل ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم تمدّن کے اخلاقی انتظام کے برقرار رکھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

[۱] یوحنا ۱۸: ۲۲-۲۳۔ [۲] اعمال ۲۵: ۱۰-۱۱ و ۱۶: ۳۷۔

اس ضمن میں ہمیں اپنے خُداوند کے طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کا بڑا اچھا موقع ہے۔ ایک خاص معاملہ میں ہمیں ایسا معلوم ہوا تھا کہ اُس کے کلام میں تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اُس کا طریقِ بیان اس قسم کا ہے کہ اُس کے کلام میں تضاد کا شبہ ہو سکتا ہے اور وہ طریقِ کلام مجازی ہے۔ چنانچہ راہبانہ زندگی کے متعلق اُس کی تعلیم اسی رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔ "اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے"۔ اس استعارہ کے ذریعہ خُداوند یہ تعلیم دیتا ہے کہ جو قوت بدی میں استعمال ہو رہی ہے۔ اُسے قابو میں لانے میں اگر تشدد سے بھی کام لینا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن مقام زیرِ بحث میں اُس کا بیان مجازی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا لفظی اور حقیقی اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بیان کو ہم ضرب المثل کہہ سکتے ہیں۔ دنیا بھر کی ضرب الامثال کو دیکھ لیجئے کہ وہ بظاہر متضاد معلوم ہوں گی۔ لیکن حقیقت میں اپنی عملی ہدایت کے اعتبار سے بالکل صاف اور واضح ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ "ایک سے دو بھلے"۔ اور دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ "دو مُلّاؤں میں مُرغی حرام"۔ اسی طرح جہاں یہ درست ہے کہ "جو اناؤلا (جلدی کرنے والا) سو باؤلا"۔ وہاں یہ بھی درست ہے۔ "جو سووے سو کھووے"۔ ان ضرب الامثال میں تضاد اور تخالف نظر آتا ہے۔ ایک اس بات پر زور دے رہی ہے کہ عقلمند اور تجربہ کار لوگوں کے مشورہ اور امداد سے انسان مستفید ہو سکتا ہے اور دوسری اس خطرہ کو ظاہر کر رہی ہے کہ بعض اوقات بہت سے آدمی مل کر کام کو خراب بھی کر دیتے

ہیں۔ ایک تو اس بات کی تلقین کر رہی ہے کہ کسی کام میں حد سے زیادہ عجلت نہ کرنی چاہیئے اور دوسری بیداری اور پھرتی کی تاکید کرتی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک خاص خاص موقعوں کے لئے خاص خاص اور درست ہدائتیں پیش کرتی ہے۔ لیکن ان کے پیش کرنے کا طریقہ وہی ہے جو عام طور پر ضرب الامثال میں دیکھا جاتا ہے۔ ایک ضرب المثل ایک حقیقت کو جو عام تو ہے۔ لیکن عالمگیر اطلاق نہیں رکھتی۔ انتہائی صورت میں پیش کرتی ہے۔ دوسری ضرب المثل کسی اور حقیقت کو اُسی پیرایہ میں پیش کرتی ہے اور جب ان دونو کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے کے متضاد اور متناقض معلوم ہوتی ہیں اور اگر ان کے لفظی معنے لئے جائیں اور دیگر قابل لحاظ باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ دونوں ناقابلِ عمل نظر آئیں گی۔

لہٰذا چونکہ ہمارا خُداوند ضرب الامثال کے ذریعہ سے تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے وہ ایک اصول پر زور دینے کے لئے اُسے انتہائی صورت میں پیش کرتا ہے۔ "اگر کوئی ..... تیرا کُرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لینے دے۔" اسی طرح ایک اور اصُول کی تاکید یوُں کرتا ہے۔ "اگر تیرا بھائی تیرا گُناہ کرے تو جا اور ..... اُسے سمجھا۔" اور اس معاملہ کی آخر تک پیروی کر۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہر ایک ضرب المثل کا صحیح اطلاق اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس بات کو معلوم کر لیں کہ وہ کونسا خاص اصُول ہے۔ جس کو کسی خاص موقع پر خاص اہمیت دینا ہے۔ کوئی بھی ایسی ضرب المثل نہیں ہے کہ

نہ جیسے ہم ہر حالت میں عمومیّت کے ساتھ اپنا قانون اور نہ دستور العمل بنا سکیں۔ بلکہ ضرب الامثال کا کام صرف خاص حقیقتوں اور عنوانوں پر زور دینا ہے۔

اب ہم اُن ہدائتوں پر غور کریں گے جو ہمارا خُداوند ہمیں دیتا ہے اور دیکھیں گے کہ ان ضرب الامثال کا فی زمانہ کیا اطلاق ہو سکتا ہے۔

"لیکن میَں تم سے یہ کہتا ہوُں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے"

ان الفاظ کی توضیح کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا مطلب کیا ہے اور اس کا اطلاق کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیا اس حکم کی لفظی اطاعت ممکن ہے؟ بعض مواقع ہمارے زندگی میں ایسے آتے ہیں۔ جہاں لفظی طور پر تو نہیں کیونکہ شاذ ہی کوئی شخص ہمارے داہنے گال پر طمانچہ مارے گا۔ لیکن عنقریب لفظی طور پر ہمیں اُس حُکم کی فرمانبرداری کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً جب کسی خاص بے عزّتی یا چوٹ کا صرف، ہماری اپنی جبلّت انتقام یا عزّت سے تعلّق ہوتا ہے اور اس کا اثر اور کسی شخص پر نہیں پڑتا اس حالت میں حلیمی اور فروتنی کے ساتھ اس بے عزتی کی برداشت کر لینا بدلا لینے سے بہت بہتر ثابت ہوتا ہے۔

فرض کیجیئے کہ آپ کے برخلاف چند شرمناک الفاظ کسی اخبار میں لکھے جاتے ہیں یا آپ کی مجلس رفقاء میں کہے جاتے ہیں اور

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون اس بے جا تشہیر کا بانی مبانی ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو اس شرارت سے از حد رنج پہنچتا ہے۔ لیکن چونکہ آپ ایک سچے مسیحی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا آپ کے لیے صرف ایک ہی راستہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ آپ حتی الوسع اپنے انتقام پسند جذبات کو مار کر اپنے دل کو ہر قسم کی شخصی نفرت اور کدورت سے پاک کریں۔ ایسے موقعوں پر آپ کو اپنے آپ کو فراموش کرنا ہے۔ آپ کو دوسرا گال پھیر دینا ہے اور ظاہر کرنا ہے۔ کہ آپ کے دل میں ذرا بھی رنج نہیں ہے۔ بلکہ آپ موقع تلاش کر رہے ہیں کہ اپنے دشمن کے ساتھ کوئی مہربانی کا سلوک کریں۔ یہ مسیح کے پیش کردہ اصول کا لفظی اطلاق تو نہیں۔ مگر عملی اطلاق ہے۔ انسان کی زندگی میں بہت سے ایسے موقع آتے ہیں۔ جبکہ اسی قسم کا وطیرہ مفید اور درست ہوتا ہے اور کسی اور طریق پر عمل پیرا ہونا اخلاقی طور پر غلط ہوتا ہے۔ یہ طریقِ عمل اسی وقت درست ہے۔ جب کوئی اقتصادی فرض ہمیں منصفانہ کارروائی پر مجبور نہ کرے۔

دوسری ہدایت حسب ذیل ہے:۔

"اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے"

مذکورہ بالا عبارت کا مطلب بھی صاف ہے۔ یعنی یہ کہ قانونی بے انصافی کا مقابلہ نہ کرو۔ یہ ایک ایسی نصیحت ہے کہ جس پر اکثر اوقات لفظی طور پر عمل کرنا چاہیئے۔" لیکن دراصل تم میں بڑا نقص یہ

ہے کہ آپس میں مقدمہ بازی کرتے ہو۔ ظلم اُٹھانا کیوں نہیں بہتر جانتے؟ اپنا نقصان کیوں نہیں قبول کرتے"[1]؟ لیکن ایسے بھی مواقع آتے ہیں جب کہ اس اصُول پر لفظی طور پر عمل کرنا ہر معقول انسان کی نظر میں مجرم اور سماج دونو کے لئے نقصان دِہ ثابت ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مَیں اس معاملہ پر ایک غیر شخصی نکتۂ خیال سے غور کر سکتا ہُوں؟ عام طور پر ہم میں سے ہر ایک کے لئے اپنے آپ کو ایسی قلبی حالت میں لانا بڑا مشکل ہے کہ ہم دیانتداری سے کہہ سکیں کہ جہاں تک میری اپنی مرضی کا تعلق ہے۔ مَیں یہ سب تکلیفات بلکہ ان سے بھی زیادہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہُوں۔ اسی طرح عدالتی چارہ جوئی سے پیشتر یہ فیصلہ کرنا۔ کہ ایسا کرنے میں میرا مقصد صرف جماعت کی بہتری اور مُجرم کی شخصی بہبُود ہے۔ بہت مشکل ہے۔

اس کے بعد حکم ہوتا ہے:۔

"اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے۔ اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا"

اُن دنوں آمد و رفت اور بار برداری کا انتظام سرکار کے ہاتھ میں تھا جو فارس کی سلطنت سے لے کر مابعد کی سلطنتوں میں رائج چلا آیا تھا۔ تو گویا ہمارا خُداوند یوں ارشاد کرتا ہے "اگر کوئی سرکاری حاکم تمہیں مجبُوراً بار برداری کے کام میں لگا لے اور کچھ فاصلے تک لے جانا چاہے تو دوگنا فاصلہ طے کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔ یعنی جو جماعتی

---

[1] ۱-کرنتھی ۶: ۷۔

مطالبات تم سے کیے جاتے ہیں۔ اُن سے جی نہ چراؤ۔ بلکہ سماجی بوجھوں کو خوشی سے اُٹھاؤ اور اپنے حصّہ سے دو چند اُٹھاؤ۔ لیکن ہمیں طبعی طور پر جزیوں اور ٹیکسوں سے نفرت ہُوا کرتی ہے ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو ٹیکسوں کو مسیحی نکتۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خوشی سے اُس قیمت کو ادا کرتے ہیں جو ایک بڑی قوم کا شریک ہونے کی حیثیت میں ہم سے طلب کی جاتی ہے۔ لیکن اِس جگہ دیانتداری کے ساتھ اپنی آمدنی پر ٹیکس ادا کرنے کے علاوہ اور بھی کسی بات کی توقع ہم سے کی جاتی ہے۔

"جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے" اور (مطابق انجیل لوقا) "جو تیرا مال لے لے اُس سے طلب نہ کر"۔

ہمارے ناظرین میں سے اکثر نے وہ تصاویر دیکھی ہوں گی جو ویسٹ منسٹر ابی (WESTMINSTER ABBEY) کے اُس پردے کی پُشت پر منقوش ہیں جو اُس کے اعلےٰ مذبح کے پیچھے ہے یہ وہ تصاویر ہیں جو ان روایات کو پیش کرتی ہیں۔ جو ایڈورڈ دی کنفیسر (EDWARD THE CONFESSOR) سے تعلق رکھتی ہیں۔

بادشاہ دن بھر کی محنت کے بعد آرام کر رہا ہے اور ہیوگولن (HUGOLIN) اُس کا ناظر خزانہ کا صندوق لاتا ہے۔ تاکہ اُس کے مختلف خدمت گزاروں کو مزدوری تقسیم کر دے۔ لیکن وہ اُسے کھلا چھوڑ کر کسی اور کام کے لیئے چلا جاتا ہے۔ اتنے میں ایک برتن صاف کرنے والا نوکر آتا ہے اور بادشاہ کو سویا ہوا خیال کر کے دو بار صندوق میں سے خزانہ لے جاتا ہے۔ لیکن جب وہ تیسری دفعہ روپیہ نکال رہا ہے

تو بادشاہ جس نے تمام ماجرا دیکھا ہے۔ بڑی متانت سے کہتا ہے "اے جوان جلدی کر اور بھاگ جا۔ کیونکہ اگر ہیوگولن (HUGOLIN) آگیا تو وہ تجھ سے کوڑی کوڑی نکلوا لے گا۔" کچھ عرصہ کے بعد ہیوگولن (HUGOLIN) آجاتا ہے اور خزانہ کی حالت دیکھ کر بادشاہ سے دریافت کرتا ہے کہ اس کا چور کون ہے۔ لیکن بادشاہ اُسے مجرم کے نام سے مطلع نہیں کرتا۔ مگر اتنا کہتا ہے۔ "اُسے ہماری نسبت روپیہ کی زیادہ ضرورت تھی۔ ایڈورڈ کے خزانہ میں کافی روپیہ ہے"۔ خداوند یسوع مسیح کی تعلیم کے مطابق دُنیوی مال و دولت مشترکہ ہونا چاہیئے تاکہ سب ضرورت مند اُس سے مستفید ہو سکیں[1]۔

آج کل بھی ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ اس قسم کے حیرت افزا سخاوت کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ تاکہ سخت دل اور مایوس اور بے پروا رُوحوں پر اثر ڈالا جائے۔ وکٹر ہیوگو (VICTOR HUGO) کی کتاب (LES MISERABLES) سے کون ناواقف ہے۔ اس قسم کے بشپ اور مفرور چور کے قصے روزمرہ کی زندگی اور تجربہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

گو اس میں شک نہیں کہ چور کو چوری کرنے دینا قرینِ عقل معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم ابتدائی قصوروں کے متعلق رحم سے پیش آنا ہمیشہ درست معلوم ہوتا ہے اور مُبتدی قصوراروں کو توبہ اور اصلاح کا موقع دینا معقول اور مناسب نظر آتا ہے اگرچہ کسی مجرم کو قانونی سزا بھگتنی بھی پڑے تو بھی اُس کے ساتھ سزا کے دوران میں اور اُس

---

[1] یہ کہانی شاہ ہنری سوم کے زمانہ کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔

کے بعد مہربانی کا سلوک کرنا چاہیئے۔ اور ایسی مہربانی جس میں تکلیف اور قربانی ہو۔ وہی رُوحانی سبق سکھلاتی ہے۔ جو بادشاہ ایڈورڈ کی مہربانی سے ظاہر ہوتا ہے۔

"جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے۔ اور جو تجھ سے قرض چاہے اُس سے مُنہ نہ موڑ۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم مختلف قسم کے بھیکاریوں کو کیا جواب دیں؟ ہمارے مشاہدے سے بہت سی ایسی حالتیں گذرتی ہیں۔ جہاں مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ مدد یا تو زبانِ قال سے یا زبانِ حال سے طلب بھی کی جاتی ہے اور ہم اُن اشخاص کی سیرت اور حالاتِ زندگی سے واقف بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بعض لوگوں پر ایسی آفتیں آجاتی ہیں کہ وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اگر عارضی طور پر مدد کی جائے تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں۔ لیکن بعض اشخاص کو دائمی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ دائمی طور پر ناکارہ اور ناقابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُن میں کام کرنے کی طبیعت اور مرضی پائی جاتی ہے۔

بعض دفعہ کسی لڑکے یا لڑکی کو امداد کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ خدمتِ انجیل یا کسی اور باوقار خدمت کے لئے تیار کئے جائیں۔ ایسی حالت میں امداد کرنا نہایت مناسب ہے۔ علاوہ اس کے اور متعدد موقعے ایسے آتے ہیں کہ ہم فیاضی کے ساتھ افراد اور انجمنوں کی امداد کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی باقاعدہ اور مسلسل خیرات فقیروں اور بھیکاریوں کو پیسے دینے کی نسبت بہت زیادہ قربانی طلب کرتی ہے۔

ایک ابتدائی مسیحی جماعت اس اصول پر کاربند ہوا کرتی تھی کہ "اپنی مٹھی کو بند رکھو جب تک کہ تمہیں معلوم نہ ہو جائے کہ تمہیں کس کو خیرات دینا ہے۔[1]"

خیرات کرنے سے پہلے عام طور پر تحقیقات کر لینی چاہیئے۔ لوگ اس سے اکثر پہلو تہی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں تکلیف اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مستحق اور غیر مستحق سائلوں میں امتیاز کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ "پیشہ ور" بھیکاری اُس گھر کے نزدیک نہیں جاتے۔ جہاں خیرات سے پیشتر تحقیقات کی جاتی ہے۔ لیکن وہ محتاج جو مستحق اور دیانتدار ہوتے ہیں۔ وہ اُس تکلیف کو دیکھ کر جو مہربانی پر مبنی ہوتی ہے۔ خوش ہوتے ہیں اور اُن کی ضمیر کو راحت پہنچتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلا امتیاز خیرات کو کس نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ مسیحی اُستادوں نے اکثر اس قسم کی خیرات کو اچھا سمجھا ہے۔[2] لیکن اگر یہ اصُول درست ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو یہ طریقہ غلط ہے۔ ایسے دینے سے ہم بغیر کسی قسم کی تکلیف گوارا کئے اپنے جذباتِ رحم کے تقاضوں کو تو پُورا کر دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر جماعت

[1] ڈیڈاچی کی تعلیم۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یوحنا رسول (۱ یوحنا ۳: ۱۷) اور یعقوب رسول (۲: ۱۵-۱۶) دونو "بھائیوں" اور "بہنوں" یعنی ہم ایمان مسیحیوں کی امداد کا ذکر کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ اُن دنوں میں عام طور پر مسیحی جماعت کے وہی شریک ہوا کرتے تھے جن کی سیرت اس امر کی مستحق تھی کہ ضرورت کے وقت اُن کی مدد کی جائے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ضرورت ہوئی کہ خیرات کے متعلق باقاعدہ انتظام کیا جائے اور تمام بشپ کے ذریعہ خیرات دیا کریں۔

[2] بزرگ ہرمس (HERMAS) نے بھی ایسی خیرات کی تلقین کی ہے۔ وہ تمام ذمہ داری کو خیرات کے حاصل کرنے والے پر رکھتا ہے۔

Scanned with CamScanner

کا نقصان کرتے ہیں۔ بھیکاریوں کو معمولی کھانا دے دینا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ لیکن وہ اکثر قبول نہیں کیا جاتا۔ ہم تھوڑی سی تکلیف برداشت کر کے سائل پر اپنی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی لڑکے کو جو بھیک مانگتا ہے۔ کسی جہاز پر نوکری دلوا سکتے ہیں.....

چاہیئے کہ ہم اُن کے متعلق "جو ہم پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتے" تکلیف اُٹھانے کو ہمیشہ تیار رہیں۔ اور اگر ممکن ہو تو روپیہ صرف کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ چاہیئے کہ ہماری زندگی سے ظاہر ہو کہ ہم ان مطالبات کو ناپسند نہیں کرتے جو ہمارے روپیہ۔ دل اور دماغ پر کیے جاتے ہیں۔ لیکن مناسب ہے کہ ہم خیرات کے تقسیم کرنے میں بھی اپنی عقل سے کام لیں۔ ورنہ ہمارا بھی وہی حال ہوگا جو ولیم لا (WILLIAM LAW) صاحب کا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ سال میں عنقریب ۲۵۰۰ پاؤنڈ خیرات کر دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ روپیہ زیادہ تر اُن بھیکاریوں کو دیا جاتا تھا جو اُن کے گھر کے احاطہ میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ یہ وطیرہ بہت جلد اُن کی مفلسی اور پڑوسیوں کے اخلاق کی بربادی کا باعث ہوا[1]۔ ہمارے خُداوند کی تعلیم ہمیں ہرگز یہ نہیں سکھاتی کہ ہماری خیرات سے لوگوں کا نقصان ہو۔

گو کلام میں بلا امتیاز خیرات کی تعلیم نہیں ہے۔ تاہم ایسی سخاوت کی ضرورت ہے۔ جس میں ایثار اور خود انکاری پائی جائے۔ مناسب ہے کہ کلام کے اس حصّہ کی تلاوت کے ختم کرنے سے پیشتر ہر ایک دولتمند یا فارغ البال مسیحی خُدا کی حضوری میں دو زانو ہو کر اپنے

---

[1] سوانح عمری ولیم لا (WILLIAM LAW) صفحہ ۲۲۴ از اوورٹن صاحب۔ (OVERTON)

دل سے دریافت کرے کہ آیا وہ خداوند کے اُن مطالبات پر جو وُہ مساکین وغربا کی طرف سے اُن کے وقت اور روپیہ پر کرتا ہے۔ غور کرتے ہیں اور کیا وہ اُن مطالبات کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

## دشمنوں کے ساتھ سلوک

"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا۔ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو۔ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سُورج کو بدوں اور نیکوں دونو پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونو پر مینہ برساتا ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو؟ کیا غیر قوموں کے لوگ بھی ایسا نہیں کرتے؟ پس چاہیئے کہ تم کامل ہو۔ جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔

مُوسوی شریعت میں الفاظ "اپنے پڑوسی سے عداوت رکھ" کہیں نہیں ملتے۔ بلکہ توریت اور عہد عتیق کے مختلف حصص میں ایسے مقامات ملتے ہیں۔ جن کی تعلیم بہت کچھ مسیحی معیار کے قریب ہے[1]

---

[1] دیکھو ایوب ۳۱: ۲۹ و خروج ۲۳: ۴۔

لیکن باوجود اس کے ہمیں ڈاکٹر موزلی (DR. MOZLEY) صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے[1]۔ "انجیل کے یہ الفاظ بلاشبہ شریعت کا مطلب اور خلاصہ ہیں"۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لفظ دشمن سے مُراد محض دشمنانِ اسرائیل ہی نہیں۔ بلکہ اس کا دائرہ وسیع تر ہے۔ لہذا بعض مسیحیوں کی ضمیر کو تکلیف ہوتی ہے۔ جب ہماری عبادتوں میں ایسے مضامیر گائے جاتے ہیں۔ جن میں دشمنوں کو لعنت ملامت کی گئی ہے۔ جیسے کہ زبور ۱۰۹ ہے۔ بعض جدید علماء ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان زبوروں میں کسی کے شخصی یا انفرادی جذبات کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ راستباز قوم اسرائیل کے اُس غضب کا بیان ہے۔ جو خداوند کے دشمنوں کے برخلاف بھڑکتا ہے۔ لیکن اس تفسیر کے متعلق بھی شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس تفسیر کو درست تصور کر بھی لیا جائے تو بھی ماننا پڑتا ہے کہ زبور مسیحی تعلیم محبت کے معیار سے بہت کمتر ہیں اور دشمنوں کی روحانی تبدیلی کی اُمید نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہم اس راستباز کو جو زبوروں میں کلام کرتا ہے مسیح تصور کرلیں تو ان میں بھی ہمیں الٰہی انصاف کے اصول نظر آتے ہیں اور عہدِ جدید میں اسی نکتۂ نگاہ سے اُن کی تفسیر کی گئی ہے۔ تاہم اگر اُن کی عام عبارت اور رنگت پر غور کیا جائے تو وہ مسیحی معیار سے گرے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس سے ہمیں حیرت بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ گو تمام عہدِ عتیق کے صحیفے الٰہی ارتقاء کی راہ پر گامزن ہیں۔ تو بھی منزلِ مقصود سے دُور ہیں۔ اور وہ منزل

---

[1] عہد عتیق کے متعلق لیکچر (LECTURES ON THE O.T.) صفحہ ۱۶۸۔

مقصود مسیح ہے۔ "تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا.....
لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں"۔

ہمارا خُداوند عہدِ عتیق کے قانونِ محبت کو زیادہ وسیع اور عمیق کرتے ہوئے طبیعت۔ زبان اور عمل میں مہر و محبت کی تلقین کرتا ہے۔ اپنی طبیعت یا خصلت میں ہمیں اپنے دُشمنوں کے ساتھ محبت رکھنی ہے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام لوگوں کے لئے ہمارے دل میں ایک ہی قسم کے جذبات ہونے چاہئیں۔ لیکن ارادہ یا بائبل کے الفاظ کے مطابق ہمارے دل میں اُن کے متعلق نیک خیالات ہونے چاہئیں یعنی یہ کہ ہم اُن کے ساتھ نیکی کا سلوک کریں اور جب ہم اس قسم کے ارادے اپنے دل میں رکھیں گے تو ممکن ہے کہ ہمارے دل سے عداوت اور کدورت بالکل نکل جائے۔ لیکن یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ پھر ہم اپنے نیک خیالات کا اظہار سلام و دعا اور ایسے الفاظ و اعمال کے ذریعہ کر سکتے ہیں جو ہماری نیک نیتی پر دلالت کریں اور آسمانی باپ کی غیر جانبدارانہ سخاوت و محبت کا نمونہ پیش کریں۔

اس جگہ دشمنوں سے محبت کرنے کے نتائج کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اگر ہم لوگوں کے متعلق یہ سمجھیں کہ جو کچھ وہ اس وقت دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت میں اور مستقل طور پر یہی ہیں تو ہم ان کی موجودہ حالت کو استقامت دینے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم لوگوں کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو چاہیئے کہ ہم اس بات کا یقین کریں کہ خُدا اُنہیں بہتر بنانا چاہتا

ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ اس طرح پیش آئیں کہ گویا ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے بہتر ہیں۔ چارلس ڈکنز (CHARLES DICKENS) صاحب اپنی کتاب (CITIES TALE OF TWO) میں ایک نہایت ہی ذہین بیرسٹر بنام سڈنی کارٹن (SIDNEY CARTON) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اپنا دشمن خود تھا۔ وہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے بیزار ہو گیا۔ اور لوگ بھی اُسے ناقابلِ اصلاح سمجھنے لگے۔ لیکن ایک رحمدل اور نیک خاتون محض اس وجہ سے اُس کی نجات اور بحالی کا مُوجب ہوتی ہے کہ وہ اس فتوے کو قبول نہیں کرتی جو دُنیا نے اُس پر لگا رکھا ہے اور گو وہ شخص کئی بار گرتا ہے اور پھر سنبھلتا ہے۔ وہ کبھی اِس کی اصلاح کے متعلق مایوس نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسی رفعت اور بُلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنی حقیقی مشفقہ کے خاوند کے لئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ اور یُوں اپنی شجاعت و مُروّت کا ثبوت دیتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم لوگوں کو اپنا دُشمن نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ ہم اپنے سلوک سے اُنہیں اپنا دوست بنا لیں گے۔ خُدا اِس لئے اہلِ دُنیا کی نجات اور بحالی میں کامیاب ہوا ہے کہ اُس نے انسان کے ساتھ اُس کی موجودہ حالت کے مطابق نہیں بلکہ اُس کے امکانات کے مطابق اُس کے ساتھ سلوک کیا ہے۔

ہمارا خُداوند ہماری توجہ اِس امر کی طرف مبذول کیا چاہتا ہے کہ ہمارا چال چلن ایسا ہونا چاہیئے جو صرف ایک فوق الفطرت محرّک یعنی الٰہی رفاقت کے محرّک کے زیرِ اثر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس

حقیقت کا اطلاق دیگر مسیحی فرائض مثل پاکیزگی پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں صرف محبت یا مہربانی کا ذکر ہے۔ "تم اپنے دوستوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے ہو۔ لیکن کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے"؟ محصول لینے والے اُس زمانہ میں سرمایہ دار ہوا کرتے تھے جو رومی سلطنت کے لئے ٹیکس فراہم کرنے کا بیڑا اُٹھایا کرتے تھے۔ خاص خاص حلقوں کے لئے خاص خاص رقوم حکومت کو دے دیتے تھے اور خود جو ممکن ہوتا تھا لوگوں سے وصول کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اُسی نام سے اُن کے کارندے بھی جو اُن کے ماتحت چونگی جمع کیا کرتے تھے کہلاتے تھے۔ عہد جدید میں محصول لینے والے اُنہیں کو کہا گیا ہے۔ عام طور پر لوگ اُن سے نفرت کیا کرتے تھے۔ اور اُنہیں ظالم اور لٹیرے تصور کرتے تھے اور اس میں بہت درجہ تک حقیقت بھی تھی۔ لیکن اس قسم کے لوگ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ لطف و محبت سے پیش آتے ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنا باہمی خوشی اور آرام و آسائش کے لئے نہایت ضروری ہے اور یہ ایک عام اقتصادی خوبی ہے۔ لیکن جو کچھ ہمارا خداوند ہم سے طلب کرتا ہے وہ محض الٰہی اور فوق الفطری محرکات کے تابع ممکن ہے۔ یہ سوال ایک نہایت ہی اہم سوال ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم خداوند کے اس فرمان کی روشنی میں اپنے اعمال اور تعلقات کا ملاحظہ کریں۔ کیا وہ ایسے ہیں جو اقتصادی حالات اور عملی ضروریات پر مبنی ہیں یا ایسے ہیں جن کی تاویل اور توجیہہ صرف الٰہی محرک سے ہو سکتی ہے؟ اس قسم کے چال و چلن کو ممکن بنانے کے لئے خداوند یسوع مسیح اس دنیا میں آیا

اور اپنے آپ کو قربان کیا۔ کیا آپ اپنی بلاہٹ کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں؟ یاد رکھئے کہ ہماری زندگی کی ترقی کا معیار خدا کا کمال ہے۔ اور خدا کا کمال مسیح کی سیرت ہے۔

"پس چاہیئے کہ تم کامل ہو۔ جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔

اس اعلےٰ معیار کو دیکھ کر ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے اندر مسیح کا روح کام کر رہا ہے۔ جو ہمیں مسیح کی مانند بناتا ہے۔ لہٰذا اگر ہمارے سامنے درست معیار و مقصد ہے اور ہم اُس نشانہ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خواہ ہماری رفتارِ ترقی بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ ہم ضرور کامل کئے جائیں گے اور وہ عرصہ جس میں ہمیں کاملیت تک ترقی کرنا ہے۔ ایک دو سال یا ایک عمر کا عرصہ نہیں ہے۔ بلکہ ابدیت کا عرصہ ہے اور ہماری زندگی میں ضرور ایسے لمحے آتے ہیں۔ جب ہم اِس بات کو پہچانتے ہیں کہ دُنیا میں اگر کوئی قابلِ تحصیل نعمت ہے تو وُہ مسیح کی سی سیرت ہے۔ لیکن چُونکہ وہ بات جس کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے نہایت ہی مشکل۔ اہم اور وسیع ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ ہم خُدا کے سامنے ہر وقت دست بدُعا رہیں کہ وہ ہمیں ہماری ضروریات کے مطابق قوت اور دانش عنایت کرے اور اس بات کا یقین کریں کہ وہ ہر وقت ہماری دعاؤں کے سننے کے لئے تیار ہے۔ آیئے ہم بزرگ آگسٹین (AUGUSTINE) کے ہم نوا ہو کر التجا کریں "جو تیرا حُکم ہے وہ عنایت کر اور پھر جو تُو چاہتا ہے وہ حُکم کر"۔

# باب ششم

## آسمان کی بادشاہت کے باشندوں کا محرک

جب ہم اس امر پر غور کر رہے تھے کہ خداوند یسوع مسیح کس طرح انتقام کے قانون کو منسوخ کر کے محبت کے قانون کی تشریح و توضیح کرتا ہے تو ہم نے اس بات کو بھی محسوس کیا تھا کہ وہ ہمیں کوئی لفظی احکام نہیں دیتا۔ بلکہ ہمارے عمل کے لئے اصول اور محرک مقرر کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ضرب الامثال کے ذریعہ اپنی ہدایات کو ہم پر ظاہر کرتا ہے اور اکثر وہ ہدایات اوامر اور نواہی کی صورت رکھتی ہیں۔ اور یہ ضرب الامثال ایک دوسرے کے متضاد اور متناقض معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تمام ضرب الامثال بظاہر اپنے اندر انتہائی ہدایات رکھتی ہیں۔ مگر دراصل وہ ہدایات انسانی زندگی کی راہنمائی کے لئے اصول اور محرک مہیا کیا کرتی ہیں۔ یہی بات خداوند کی ضرب الامثال کے متعلق درست ہے۔

ہم سچائی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پہاڑی وعظ مسیحیوں کے لئے ایک اقتصادی شریعت پیش کرتا ہے۔ اس خیال کی توضیح یوں ہو سکتی ہے کہ پہاڑی وعظ چند ایک عملی اصول قائم کرتا ہے جن کا اطلاق ہر ایک مسیحی کو اپنی اقتصادی اور تمدنی زندگی پر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ قانونی احکام سے گریز کرتا ہے اور صرف

اصُول اور محرک مہیا کرتا ہے۔ اس لیئے وہ ہر فرد کے دل اور ضمیر پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ سیرت جو اِن نئے تاثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ تمام اقتصادی زندگی کو ایک نئی بُنیاد پر قائم کیا چاہتی ہے۔ لہذا ان معنوں میں پہاڑی وعظ مسیحیوں کے لئے ایک اقتصادی شریعت ہے اور آپ پہاڑی وعظ کی ہدایات میں سے کسی ایک کو لے کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک اقتصادی قانون ہے۔ مثلاً آپ خُداوند کے فرمانوں "جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے" یا "اگر کوئی تیرا کُرتہ لینا چاہے۔ تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے" کو لے کر مسیحیوں کی تہذیب ظاہر کے قوانین قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں گے۔ تو ہم تمام انسانی تمدن کی بنیاد کو معرضِ خطر میں ڈال دیں گے اور خُداوند کی اُس ہدایت کو جو ایک اور ضمن میں پیش کی جاتی ہے اور ان کے بالکل برعکس ہے۔ نظر انداز کر دیں گے۔

لیکن خُداوند کے یہ تمام مقولہ جات ہر فرد کے دل اور ضمیر میں جاگزیں ہو کر اُس کی سیرت اور چلن کے لئے اصُولوں کا کام دے سکتے ہیں اور بعد میں وہی اصُول اُس فرد یا کلیسیا یا زمانہ کی سمجھ کے مطابق اقتصادی زندگی میں نمُودنما ہو سکتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ ہمارا خُداوند ہمیں چند اصُول دیتا ہے نہ کہ قوانین اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم اس وعظ کے دوسرے بڑے حصّہ پر غور کرتے ہیں جس میں وہ صرف ان اغراض و محرکات پر بحث کرتا ہے جو ہر فرد کے دل کی پوشیدہ گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں تو

وہ دُنیوی طبیعت اور مزاج سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی غرض سے ایسے مذہبی اعمال کی مخالفت کرتا ہے۔ جو محض دیدنی اور ظاہری ہیں۔ لیکن اُس کی اپنی زندگی۔ اُس کا ایک جماعتی مذہب قائم کرنا۔ اور عبادتِ عام سے برکتوں کے وعدے منسوب کرنا اور یہ متضاد حکم دینا کہ "تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ سکیں"۔ یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں۔ کہ یہ ہدایات ضرب الامثال ہیں۔ لہٰذا ان میں اصولوں کو تلاش کرنا چاہیئے نہ کہ قوانین کو۔

متّی کی انجیل کے چھٹے باب میں شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی مضمون پر بحث کی جاتی ہے اور وہ ایک زبردست اصول ہے۔ یعنی یہ کہ نئی راستبازی یا بادشاہت کے شہریوں کی راستبازی خُدا سے تعلق رکھتی ہے۔ خُدا اس کا محرک ہے۔ خُدا اس کا مقصد ہے۔ خُدا اس کی غایت ہے۔ ابتدا سے انتہا تک خُدا ہی خُدا ہے۔ وہ شخص جس کے تمام چلن اور زندگی کا رُخ خُدا کی طرف نہیں ہے۔ وہ اُس بادشاہت کا شریک نہیں ہو سکتا۔

سب سے پہلے ہم آیات ۱ سے ۱۸ پر غور کریں گے اور اُن اجنبی ہدایات کو چھوڑ دیں گے۔ جو دُعا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اِن آیات کا ایک ہی مضمون ہے۔ یعنی یہ کہ مسیحی راستبازی محض الٰہی تعریف کی مقتضی ہے۔ انسانی تعریف کی اُسے مطلقاً جستجو نہیں ہے۔ پہلے ہمارا خُداوند عام راستبازی کا ذکر کرتا ہے اور بعد میں اُس کی مختلف شاخوں کا بیان کرتا ہے۔ عام راستبازی کے

متعلق خُداوند کہتا ہے :-

"خبردار اپنی راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو۔ نہیں تو تمہارے باپ کے پاس جو آسمان پر ہے۔ تمہارے لئے کچھ اجر نہیں ہے"۔

ہم شروع ہی میں بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارا خُداوند انعام یا اجر کی خواہش کو بُرا نہیں کہتا۔ بشرطیکہ ہم خُدا سے اُس کی توقع کریں۔ دُنیا میں ایسے ایسے لوگ خود فراموش ہوئے ہیں جو خُدا سے بھی ابدی انعام حاصل کرنے کی جستجو کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بہترین مذہبی محرّک وہ ہے جس کا ذکر فرانسس زیویئر (ST. FRANCIS XAVIER) صاحب یوں کرتے ہیں۔ "اَے خُدا میں تجھے پیار کرتا ہوں۔ لیکن اِس لئے نہیں کہ مجھے تجھ سے بہشت کی اُمید ہے"۔ اُنہیں اُس شخص کے ساتھ اتفاق ہے۔ جس نے کہا کہ مَیں دوزخ کے شعلوں کو پانی سے بجھا دوں گا اور بہشت کی خوبیوں کو آگ سے جلا دوں گا۔ تاکہ لوگ خُدا کو خود اُسی کی وجہ سے تلاش کریں۔ نہ کہ خارجی وجوہات کے سبب۔ لیکن یہ فلسفی یہ غلطی کرتے ہیں کیونکہ وہ انسانی فطرت کی ضروری اور لازمی جبلّتوں کو بھول جاتے ہیں۔ ہم خُدا کی محبت اور اُس میں خوشی حاصل کرنے کی خواہش کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ یہ خواہش ہماری شخصیت کا ضروری حصّہ ہے۔ ہمارا فطری خاصہ ہے کہ ہم داد اور تعریف اور مقبولیت کی خواہش کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں خُدا سے صِلہ حاصل کرنے کی خواہش کرنا چاہیئے نہ کہ انسان

سے۔ کیونکہ وہ اَجر جو خُدا سے ملتا ہے۔ کبھی ہماری مفید اور کار آمد ہونے کی قابلیّت کو کم نہیں کرتا اور نہ ہی کبھی ہمیں تنگ دِل اور تنگ خیال بناتا ہے۔ ایک مناسب اور درست قسم کی حب النفس ہے۔ جو اَبدی دُنیا میں خُدا کی رفاقت سے لُطف حاصل کرتی ہے۔ اگر الٰہی انعام واجر کو حاصل کرنے کی خواہش سے کبھی مذہبی دُنیا میں کسی کو نقصان پہنچا ہے تو اِس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ ہم نے خُدا کی سیرت کے اُس تصوّر کو جو یسُوع مسیح کی زندگی اور تعلیم میں پیش کیا گیا ہے۔ فراموش کر دیا ہے۔ اگر ہم حقیقی خُدا کی تلاش کریں تو ہم دُنیا اور انسانی جماعتوں کی کبھی کم قدری نہ کریں گے اور نہ ہی کبھی مذہب میں خود غرضی کی برداشت کریں گے۔ جس نے یہ کہا ہے "اگر آدمی ساری دُنیا حاصل کرے اور اپنی جان (رُوح) کا نقصان اُٹھائے تو اُسے کیا فائدہ ہوگا"؟ اُس نے یہ بھی ارشاد کیا ہے کہ "جو کوئی اپنی جان (رُوح) بچانی چاہے۔ وہ اُسے کھوئے گا"۔

اس کے بعد ہمارا خُداوند اُس عام اصُول کا اطلاق کرتا ہے۔ جس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ انسانی چال و چلن کے تینوں حصّوں کے متعلّق خُدا کی رضامندی کی تلاش کرنا چاہیئے۔ مسیحی زندگی بلکہ عام انسانی زندگی کے فرائض تین حصّوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ اوّل ہماری زندگی کے وہ فرائض ہیں جو خُدا سے تعلّق رکھتے ہیں۔ دوم وہ فرائض جو ہمارے پڑوسی سے تعلّق رکھتے ہیں اور سوم وہ فرائض جو خود ہم سے متعلّق ہیں اور انسانی چال و چلن کے ان تینوں پہلوؤں کے ساتھ ایک ایک مختص فعلیّت

وابستہ ہے۔ ہمارے وہ فرائض جو خُدا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وُہ اپنے آپ کو دُعا کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے وہ فرائض جو انسان سے متعلق ہیں۔ رحم کے کاموں اور خیرات میں ظاہر ہوتے ہیں اور ہمارے وہ فرائض جو خود ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود ضبطی یا خود انکاری یعنی روزہ میں اظہار پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا خُداوند اس عام اصُول کا اطلاق ان ہر سہ فرائض پر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنی دُعاؤں۔ اپنی خیراتوں اور اپنے روزوں میں صرف خُدا سے تعریف حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اور پیشتر اس سے کہ ہم ان تین مقامات کا مطالعہ کریں۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ آپ اِس بات پر غور کریں کہ ہمارے خُداوند کے نزدیک انسانی زندگی ہمیشہ تین سمتوں میں حرکت پذیر ہوتی ہے یعنی سب سے پہلے ہمارے وہ فرائض جو خُدا کی طرف ہیں یہ فرائض سب سے مقدّم ہیں۔ اور انسانی فرائض کے ساتھ مخلوط نہ ہونے چاہئیں۔ اور یہ فرائض شخصی فرائض ہیں۔ جو خُدا کے ساتھ بہ حیثیت ایک شخص کے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لئے سب سے اوّل اور مقدّم حُکم یہ ہے کہ خُداوند اپنے خُدا کو پیار کرو۔ اس کے بعد وہ فرائض ہیں جو ہمارے پڑوسی سے متعلق ہیں۔ اور آخر میں وہ فرائض جو خود ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ "اپنے پڑوسی سے محبت رکھ۔ اپنی مانند"۔ ہمارے فرائض جو خود ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ ہیں کہ ہم اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترقّی کی کوشش کریں۔ ہم میں سے ہر ایک خُدا کا تیار کردہ آلہ

ہے۔ جس میں وہ تمام قوتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کے مجموعہ کو بائبل روح یا زندگی کہتی ہے۔ لہذا چاہیئے کہ انسان تمام قوتوں کی ترقی ونشوونما کی کوشش کرے اور چونکہ انسان ایک روحانی ہستی ہے۔ اور درست روحانی افعال کا اہل ہے۔ لہذا مناسب ہے کہ ہر ایک انسان اپنے آپ کو اپنے پڑوسی کو اور اپنے خدا کو پیار کرے۔ اپنے آپ کو پیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایسی حالت میں رکھے کہ اس کے جسمانی اور عقلی قواء بہترین طور پہ کام کر سکیں۔ اور یہ بغیر روزہ یا نفس کے مارنے کے ممکن نہیں۔ اپنے پڑوسی سے محبت رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اُس کے مفاد کی اُس درجہ تک محافظت کریں۔ جس درجہ تک اپنے مفاد کی کرتے ہیں۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے مال وملکیت میں سے دوسروں کی احتیاجوں کے رفع کیئے جانے کے لیئے کچھ دیں۔ یا بالفاظ دیگر خیرات کریں۔ اور خدا سے محبت رکھنا یہ ہے کہ ہم اُسے ایک شخص ہستی سمجھتے ہوئے دُعا کے ذریعہ اُس کے سامنے شخصی درخواستیں پیش کریں اور اِن تمام کوششوں میں ہمیں خدا کی رضامندی اور خوشی کی تلاش کرنا ہے۔

## خیرات

"پس جب تُو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا جیسا ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُن کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں

وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تُو خیرات کرے تو جو تیرا
دہنا ہاتھ کرتا ہے۔ اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جاننے تاکہ تیری
خیرات پوشیدہ رہے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو
پوشیدگی میں دیکھتا ہے۔ تجھے بدلا دے گا"

صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ ہمارا خُداوند ایک استعارہ کی صورت میں کلام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہودیوں کا یہ دستور نہ تھا کہ جب وہ خیرات کرنے نکلا کرتے تھے تو خود لفظی طور پر اپنے آگے نرسنگا بجوایا کرتے تھے۔ اسی طرح جب خُداوند یہ فرماتا ہے کہ جو تیرا دہنا ہاتھ کرتا ہے اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے تو یہ بھی ایک استعارہ ہے۔ لیکن یہ استعارہ نہایت ہی واضح اور پُر معنی ہے اور خُداوند اس کے ذریعہ سے یہ سکھانا چاہتا ہے کہ کارہائے خیر میں نمائش اور تشہیر نہایت ہی معیوب ہیں۔

اور یہ معاملہ ایسا ہے کہ ہر ایک شخص کو خود فیصلہ کرنا چاہیئے اور اپنے اغراض و مقاصد کا معائنہ کرے .... ہمیں اس بات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کہ جب ہم کوئی نیک کام کر رہے ہیں تو لوگوں کی نظریں ہماری طرف لگی ہوئی ہوں۔ بلکہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہماری غرض کیا ہے اور یہ فیصلہ جلد ہو سکتا ہے۔ کیا جب لوگ ہماری طرف دیکھنا بند کر دیتے ہیں تو ہم اُس کارِ خیر سے دست بردار ہو جاتے ہیں؟ یا جب ہم تنہائی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ تب اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں؟ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہمیں لوگوں کی نظروں سے ڈرنا نہ چاہیئے

ایک دفعہ خُدا کے ایک مقدّس بندے نے شیطان کو یہ جواب دیا۔ "نہ تو تیری وجہ سے یہ کام مَیں نے شروع کیا ہے اور نہ ہی تیری وجہ سے اسے بند کروں گا۔" لیکن برعکس اس کے اگر مشنری میں چندہ جمع کیا جاتا ہو۔ تو آپ ایک روپیہ ڈالیں۔ مگر جب تحصیلی پیش کی جائے۔ جس میں آپ کا چندہ نظر نہ آسکے تو ایک پیسہ پر اکتفا کریں یا چندہ کی فہرست میں آپ اپنے نام کے آگے تشہیر کی اُمید پر ایک بڑی رقم لکھ دیں تو یاد رکھئے کہ ایسا کرنے میں آپ کا مقصد خُدا کو خُوش کرنا نہیں ہے۔

علاوہ اس کے یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہُوں کہ وُہ لوگ جو نیک کاموں کے لئے روپیہ جمع کیا کرتے ہیں اُنہیں چاہیئے کہ چندہ دہندگان کو بُری اغراض سے بچائیں۔ کیونکہ اگر وہ غلط اغراض سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو وہ لوگوں کے گناہوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور وہ روپیہ خُدا کے جلال اور اُس کی خدمت کی ترقّی کا موجب نہیں ہو سکتا۔

## دُعا

"اور جب دُعا مانگو تو ریاکاروں کی مانند نہ ہو۔ کیونکہ وہ عبادت خانوں میں اور بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دُعا مانگنی پسند کرتے ہیں تاکہ لوگ اُنہیں دیکھیں۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تُو دُعا مانگے۔ تو اپنی کوٹھڑی میں جا۔ اور

دروازہ بند کر کے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے
دُعا مانگ۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں
دیکھتا ہے۔ تجھے بدلا دے گا۔"

خُدا کی قربت حاصل کرنے کے متعلق بھی الٰہی خوشنودی کی جستجو کے اصول کا اطلاق کیا جاتا ہے اور ضرورت نہیں کہ ہم اس کی زیادہ توضیح کریں۔ لیکن ہم ایک مقابلتاً ادنےٰ اصول پر غور کیا چاہتے ہیں۔ جس کا خیرات اور روزہ کے بیان میں بھی ذکر آیا ہے۔ یعنی معاوضہ کا اصول۔ "وہ اپنا اجر پا چکے۔"

ہر کام کا اجر کام کرنے والے کی نیت کے مطابق ملتا ہے۔ اگر آپ انسانی تعریف کی خواہش کریں گے تو ضرور کم و بیش حاصل ہو جائے گی۔ اگر آپ اعلےٰ مرتبہ حاصل کیا چاہتے ہیں۔ اور بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیتے ہیں تو بڑا امکان ہے کہ آپ اُس مرتبہ تک پہنچ جائیں۔ الغرض دُنیا میں مُراد بر نیت کا اصول کام کر رہا ہے اور ہمارا خُداوند بھی ان ادنےٰ اغراض اور ان کے مناسب اجر کو تسلیم کرتا ہے اور پُرانے عہدنامہ میں کئی دفعہ خُدا اس قسم کے انعامات تقسیم کرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً خُدا دیکھتا ہے کہ بنوکد رضر صور کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ لیکن اُسے کوئی اُجرت نہیں ملتی (حزقی ایل ۲۹: ۱۸-۲۰) اس لئے وہ مصر کا مُلک اُنہیں عنایت کر دیتا ہے۔

لہٰذا اگر آپ کی غرض زمینی ہے تو آپ کا اجر بھی زمینی ہوگا۔ اور جب آپ نے اپنا اجر پورے طور پر حاصل کر لیا تو

پھر خُدا سے کسی اور انعام کی توقع نہ کرنی چاہیئے۔ جان ہنری نیومن صاحب (JOHN HENRY NEWMAN) ایک نہایت ہی مُتقی اور دیندار شخص تھے۔ اور اُن اشخاص میں سے تھے جو بغیر نمائش اور ریاکاری کے اپنے دل کے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب اُنہیں کارڈینل (CARDINAL) کا مرتبہ ملا تو کہنے لگے کہ مَیں اِس اعزاز کو قبول کرتا ہُوا ڈرتا ہُوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے قبول کرنے سے مَیں اپنا تمام اجر زمین پر ہی حاصل کر لُوں۔ اور آسمان پر میرے لیئے کوئی انعام نہ رہے۔ کیونکہ یہ بزرگ عہدہ میری زندگی کے تمام اچھے کاموں کا کافی اور مناسب صِلہ ہے۔

ضرور نہیں کہ ہم اس قسم کے خوف کے احساس پر بہت غور کریں۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ سچّا مسیحی نہ صرف ہر وقت تعریف و اجر کی تلاش میں نہیں رہتا۔ بلکہ اگر اُس کے ہر کام کا کامل اجر ملتا رہے تو وہ فکرمند ہونے لگتا ہے۔ وہ تو خُدا کی رضامندی کا خواہشمند ہے۔ لہٰذا اگر اُسے دُنیوی اجر حاصل ہوتا رہے تو وہ اُسے ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ اُس سے اُس کے دِل میں اپنی اغراض کے متعلق شک پیدا ہوتا ہے۔

## روزہ

"اور جب تُم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اُداس نہ بناؤ۔ کیونکہ وُہ اپنا مُنہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ

اُنہیں روزہ دار جانیں۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ وُہ
اپنا اجر پا چُکے۔ بلکہ جب تُو روزہ رکھے تو اپنے سر میں
تیل ڈال اور مُنہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو
پوشیدگی میں ہے تُجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں
تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلا دے گا۔"

اس جگہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ خُداوند جب روزہ۔ دُعا اور خیرات کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے تو وہ عام یا جماعتی دینی کاموں کے خلاف کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ کلام میں ایسے کاموں کی تائید اور تاکید پائی جاتی ہے۔ مثلاً پولُوس ہمیں چندے کی تلقین کرتا ہے۔ (۱کرنتھی ۱۶: ۲) اور ہمارا خُداوند مل کر دُعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے۔ (متی ۱۸: ۱۹-۲۰) اور بعد میں پاک عشاء کی رسم کو مقرر کرتا ہے۔ جس میں کلیسیا کے شرکاء آپس کی باہمی رفاقت اور خُدا کی قربت کو حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ تصور کرنا بالکل فضول ہے کہ خُداوند یسُوع مسیح جماعتی دینی کاموں کے برخلاف تعلیم دے رہا ہے اور کہ وہ ایسے کاموں کو ہیچ جانتا ہے جنہیں تمام کلیسیا مجموعی طور پر انجام دیتی ہے اور جن کی انجام دہی میں اشتراک عمل کی طبیعت اور قوم اور خُدا کے فرائض کی ذمہ داری کے احساس کی تقویّت ہوتی ہے۔ لیکن وہ دینی کاموں کا ایک نیا محرّک پیش کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ خواہ ہم دُعا کریں۔ خیرات دیں یا روزہ رکھیں ہمارا محرّک خُدا ہونا چاہیئے نہ کہ انسان۔

ہم پھر اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا خُداوند اس

جذبات کے عملی اظہار کے برخلاف کچھ نہیں کہتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کبھی مناسب طریق سے دُعا نہیں کر سکتے جب تک کہ خلوتی اور جماعتی دُعا کے موقعوں پر اپنی طبیعت اور خیالات کی اصلاح نہ کر لیں اور حقیقی فروتنی اور انکسار سے کام نہ لیں۔ لہٰذا چاہیئے کہ ہم بڑی عاجزی کے ساتھ دوزانو ہو کر خُدا کے حضُور میں دُعا کریں اور چونکہ ہماری ساخت میں رُوح اور جسم دونوں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے رُوحانی جذبات دُرست اور مناسب جسمانی حرکات میں ظاہر ہوں۔ یہ خیال کرنا کہ عبادت چونکہ ایک رُوحانی عمل ہے اس لئے جسم کو اس میں دخل نہیں غلط ہے۔ بلکہ اس میں جسم اور رُوح دونوں شامل ہیں۔ لہٰذا اگر ہم دُرست طریق پر یعنی گھٹنے ٹیک کر دُعا کرنا سیکھ جائیں تو ہم اُسی عادت کو اپنی جماعتی زندگی میں جگہ دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم روزہ رکھنا چاہتے ہیں تو ضرور ہے کہ ہماری یہ خواہش کوئی خاص عملی اظہار اختیار کرے۔ ہمیں مذہب کے دیدنی اظہارات سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ ہمارا خُداوند تو صرف درست غرض یا نیّت پر زور دے رہا ہے جو ہماری راستبازی کے تمام کاموں کی بنیاد ہو۔ خواہ وُہ کام عبادت، خیرات یا ریاضت سے متعلق ہوں۔

سوم۔ ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ روزہ کے معنی اور اُس کے بُنیادی اصُول کیا ہیں۔ نئے عہدنامہ میں ہمارا خُداوند دُعا کی نسبت روزہ کا کم ذکر کرتا ہے اور آپ ترمیم شدہ ترجمہ (REVISED VERSION) میں کئی جگہ لفظ "روزہ" کو غیر موجود پائیں گے۔ جہاں

پہلے ترجمہ (AUTHORIZED VERSION) میں دُعا[1] کے پہلو بہ پہلو اُس کا بھی ذکر پایا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ سچ ہے کہ خُداوند دُعا کی نسبت روزہ کا کم ذکر کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روزہ میں دُعا کی نسبت زیادہ ریاکاری اور نمائش کا دخل ہو سکتا ہے اور خُداوند کے دِنوں میں ایسا ہوتا بھی تھا۔ لیکن اس بات پر حد سے زیادہ زور دینا اور روزہ کی عدمِ ضرورت پر اصرار کرنا درست نہیں ہے۔ ہمارا خُداوند خود دُعا کے ساتھ ساتھ روزہ بھی رکھا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ اُس نے چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ رکھا اور اُس نے فرمایا کہ شاگردوں کو بھی روزہ رکھنا چاہیئے اور یہ کہ اُس وقت کا نشان ہوگا جب کہ وہ اُن سے جُدا کیا جائے گا۔ پولُوس بتلاتا ہے کہ وہ روزہ رکھنے کا عادی تھا "بارہا فاقہ کشی میں" اور وہ مسیحیوں کو تلقین کرتا ہے کہ اپنے جسم کو مارو اور کوٹو تاکہ اُسے قابو میں رکھ سکو[2]۔ اسی طرح کلیسیا نے بھی شروع سے روزہ رکھا ہے۔ اُن تمام ہستیوں نے خود روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ جن کے ذریعہ سے بڑی بڑی کلیسیائی بیداریاں وقوع میں آئیں۔ مثلاً سیمین (SIMEON) پیسی (PUSEY) اور ماریس (MAORICE) وغیرہ۔ لہٰذا روزہ کی ضرورت کو نظرانداز کرنا بیوقوفی ہے اور روزہ کا مقصد یہ ہے کہ جسم کو رُوح کے تحت میں لایا جائے۔ کیونکہ بغیر روزہ کے ممکن ہے کہ جسم رُوح پر غالب آجائے۔ روزہ رکھنے کی وجہ یہ نہیں

[1] یعنی متّی ۱۷: ۲۱+ مرقس ۹: ۲۹ + ۱ کرنتھی ۷: ۵ - [2] ۱ کرنتھی ۹: ۲۷ + ۲ کرنتھی ۱۱: ۲۷-

ہے کہ ہمارا جسم بُرا ہے۔ بلکہ یہ کہ ہمارا جسم پاک ہے یا پاک ہونے کے لئے خلق کیا گیا ہے اور اس سے یہ طلب کیا جاتا ہے کہ وہ رُوح کا ایک مفید اور کارگر آلہ ہو۔ بعض اوقات لوگ جسم کو محض بہیمی خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ رُوح اُس کے ساتھ پیوست کر دی گئی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ قدرت نے ہماری تمام ہستی کو روحانی بنایا ہے اور رُوح کو اُس پر حاکم مقرر کیا ہے۔ جس طرح اصُولِ زندگی غیر ذی حیات اشیا میں داخل ہو کر تمام فطرت میں زندگی کا دم پھُونک دیتا ہے۔ اسی طرح جب رُوح بہیمی جسم پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ تو اس کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ تمام جسم کو رُوحانی بنا لے۔

بعض اوقات لوگ نفسانی گناہوں کو "طبعی" کہہ کر قابلِ مُعافی سمجھتے ہیں۔ اس میں اصُولی غلطی یہ ہے کہ وہ جسم کو رُوح سے علیحدہ سمجھ کر اُس پر حُکم لگاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ کوئی چیز بھی انسان کے لئے "طبعی" نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اُس کی رُوحانی طبیعت بھی اُس کی ساخت میں شامل نہ سمجھی جائے اسی لئے مسیحی شادی کو حقیقی معنوں میں "طبعی" کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جنسیت کے تعلّقات میں ایک رُوحانی مقصد کو داخل کرتی ہے اور اُسے گھر اور خاندان کی تعمیر اور پرورش کا ذریعہ بناتی ہے۔ اسی طرح کھانے اور پینے میں بھی رُوحانی مقاصد ہونے چاہئیں۔ ہر ایک بات جو ایک سچّا مسیحی کرتا ہے وہ ایک بڑے رُوحانی مقصد کا حصّہ ہے۔ اسی لئے مَیں نے عرض کیا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہمیشہ پولُوس رسول کے فرمان کے مُطابق اپنے جسم کو مارتے کوٹتے رہیں تاکہ وہ مُشتر

بے مُہار نہ ہو جائے اور رُوح اختیار سے باہر نہ ہو جائے۔ بلکہ ہمیشہ غلام کی طرح رُوح کے زیرِ فرمان رہے۔

اسی وجہ سے اگر ہم اس طور پر روزہ رکھیں کہ ہمارا جسم رُوحانی اعمال کے قابل نہ رہے تو یہ روزہ عقل اور مسیحیت کے خلاف ہوگا۔ علےٰ ہذالقیاس اگر ہمارا روزہ رکھنا ہمیں کام کرنے سے روکتا ہے تو وہ ہمارے فرائض کی انجام دہی میں مُخل ثابت ہوتا ہے لیکن برخلاف اس کے بہت لوگ ایسے ہیں جو ضرورت سے زیادہ کھاتے پیتے اور سوتے ہیں اور اُن کا جسم رُوح پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چاہیئے کہ وہ روزہ رکھیں اور اپنے جسم کو رُوح کے تابع کریں۔

"خُدا کا کلام ہمیں روزہ کی تلقین کرتا ہے۔ کلیسیا ہم سے کہتی ہے :۔ "اپنی ماں کو اتنا دے۔ جتنا تُو اور جماعتوں کو دینے کے لئے تیار ہے"۔

اب ہم اُس جملہ معترضہ پر غور کیا چاہتے ہیں۔ جو دُعا کے متعلق ۱۶-۷-۱۵ میں پایا جاتا ہے۔ اِن آیات میں اِس سے زیادہ تعلیم پائی جاتی ہے کہ دُعا کا مقصد نمائش نہیں۔ بلکہ خُدا کی تعظیم و ستائش ہے۔

پہلی بات یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ دُعا کا معیار طوالت نہیں ہے۔ بلکہ شدت ہے۔

"دُعا مانگتے وقت غیر قوموں کے لوگوں کی طرح بک بک نہ کرو۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بہت بولنے کے سبب ہماری سُنی جائے گی"۔

اگر آپ کسی ایسے مُلک میں جائیں۔ جہاں بُدھ مذہب کا دَور دَورہ ہے تو آپ معلوم کریں گے کہ دُعا کو ایک ایسی رسمی سی چیز بنا دیا گیا ہے کہ لوگوں کو خود دُعا کرنی نہیں پڑتی۔ بلکہ وُہ دُعا کے پہیوں اور جھنڈوں کے ذریعہ اپنی دُعاؤں کو اپنے معبُود کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ مسیحی کلیسیا میں بھی اکثر اسی قسم کی رسمی دُعائیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارا خُداوند بتلاتا ہے کہ دُعا کی قدر و منزلت اس کے طول پر منحصر نہیں بلکہ اُس توجہ اور قوّت ارادی پر منحصر ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں۔ چاہیئے کہ ہم ہمیشہ اس بات کو یاد رکھیں۔ کیونکہ بڑا احتمال ہے کہ ہم دُعا کو ایک فرض سمجھتے ہوئے اور کسی خاص قاعدہ اور دستور کے ماتحت عمل کرتے ہوئے اُسے محض ایک رسم یا دستور بنا دیں اور یُوں لمبائی کو اُس کی خوبی کا معیار مقرّر کر دیں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ مسیحی دُعا کا مقصد خُدا کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہے۔

"پس اُن کی (غیر قوموں) مانند نہ بنو۔ کیونکہ تمہارا باپ تمہارے مانگنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ تم کن کن چیزوں کے محتاج ہو"۔

اِس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیوں خُدا چاہتا ہے کہ ہم اُس سے دُعا مانگیں؟ اس کا جواب نہایت ہی سادہ ہے۔ خُدا ہمارا باپ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اُس کے ساتھ ایک تعلق قائم کریں۔ لہٰذا جس طرح کہ خُدا کی بہت سی نعمتیں محنت

کرنے سے دستیاب ہوتی ہیں۔ اسی طرح اُس کی بہت سی نعمتیں ایسی بھی ہیں جو مسلسل اور متواتر مانگنے سے ملتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خُدا ہمیں وہ نعمتیں دینا نہیں چاہتا بلکہ یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم مانگیں۔ تاکہ ایک مشخّص خُدا کے ساتھ لگاتار تعلق قائم کرنے کی ضرورت اور بار بار اُس کے سامنے اپنی درخواستوں کو پیش کرنے سے ہم اس راز سے بخوبی واقف ہو جائیں کہ وُہ ہمارا آسمانی باپ ہے اور ہم اُس کے بیٹے ہیں۔ اور اس انتظام کی خوبی ہم پر اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم اس بات پر لحاظ کرتے ہیں کہ دُعائیہ زندگی میں فرق آجانے سے ہمارے اور خُدا کے باہمی تعلق میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہماری دُعاؤں کا مقصد خُدا کے علم کو بڑھانا نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم میں اپنے آسمانی باپ کے ساتھ ربط و تعلّق پیدا کرنے کی عادت ہو جائے۔

# باب ہفتم

## خُداوند کی دُعا

ہمارا خُداوند دُعا کے متعلق عام نصیحت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک نمونہ پیش کر کے ہمیں سکھاتا ہے کہ دُعا کیونکر مانگنی چاہیئے۔

"پس تُم اِس طرح دُعا مانگا کرو۔ کہ اَے ہمارے باپ
تُو جو آسمان پر ہے۔ وغیرہ"

اس عجیب و غریب دُعا کے متعلق مَیں صرف یہ کوشش کروں گا کہ اُس کی چند اہم باتیں اپنے ناظرین کے سامنے پیش کروں۔ اور چند ایک مشکلات کو دُور کرنے کی کوشش کروں اور آخر میں اُن اصُولوں کا ذکر کروں جو اِس دُعا میں پائے جاتے ہیں۔

"اَے ہمارے باپ تُو جو آسمان پر ہے"

دُعا کی طبیعت اور رُوح کا انحصار بہت درجہ اس بات پر ہے کہ عابد کا تصوّر خُدا درست ہے یا غلط۔ مناسب ہے یا نامناسب۔ مسیحی خُدا کو اُس کے بہترین نام سے یاد کرتے ہیں۔ "اَے باپ" کیونکہ "خُدا نے اپنے بیٹے کا رُوح ہمارے دِلوں میں بھیجا۔ جو ابّا یعنی اَے باپ کہہ کہہ کر پُکارتا ہے"[1] اور ہم اُسے "اَے باپ تُو جو آسمان پر ہے" اس لئے نہیں کہتے کہ وہ ہم سے بہت دُور ہے

---

[1] گلتیوں ۴: ۶۔

کیونکہ مسیح کی بادشاہت میں آسمانی اور زمینی چیزوں کا اتحاد نظر آتا ہے۔ اور ہم آسمانی یروشلیم کے پاس.... آئے ہیں۔ لیکن اس لیئے کہ "جس طرح آسمان زمین سے بلند ہے" اسی طرح وہ بھی انسان کی جہالت گندگی اور گناہ سے بلند اور دُور ہے۔ لہٰذا ہم جو اپنے خدا کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ہم سے اس قدر دُور ہے جس قدر آسمان زمین سے اور یہ بھی کہ وہ ہمارے اس قدر قریب ہے جس قدر باپ بیٹے کے۔ اور ہماری سب سے پہلی دُعا یہ ہے۔

"تیرا نام پاک مانا جائے۔"

خدا کا نام کیا ہے؟ یہ سوال ایک نہایت ہی اہم سوال ہے۔ بائبل کی رُو سے خدا کا نام وہ ہے۔ جس کے ذریعہ خدا اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یُوں کہیں کہ خدا کا نام خود خدا ہے جو ظاہر ہو چکا ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کیا ہے۔ اُس نے اپنے بزرگ نام کا تجزیہ کر کے اُس کو حرف بہ حرف انسان کی آنکھوں کے سامنے بلکہ اُس کے دل میں ظاہر کر دیا ہے۔ اُس نے اپنا مکاشفہ فطرت۔ انسانی ضمیر۔ نبیوں اور اپنے بیٹے یسوع مسیح کے ذریعہ انسان کو بخش دیا ہے۔ لہٰذا خدا کے نام کو پاک یا مقدس بنانا گویا اُس خدا کو تسلیم کرنا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو باپ۔ بیٹا اور رُوح القدس میں ظاہر کیا ہے۔ اور یہ دُعا کرنا کہ اُس کا نام پاک مانا جائے۔ گویا یہ چاہنا ہے کہ لوگ اُس خدا کو مانیں جس نے بنی نوع انسان کو اپنا مکاشفہ عنایت کیا ہے اور اُس کے مذہب کو نہ صرف

لہ عبرانیوں ۱۲: ۲۲۔

قلبی بلکہ علانیہ طور پر بھی قبول کریں۔ اُسے اپنے عمل اور عبادت میں جگہ دیں۔ کلیسیا اور حکومت میں سرفراز کریں اور اتوار اور دیگر ایام میں قابلِ پرستش جانیں۔

"تیری بادشاہی آئے"

یہودیوں کے نزدیک خُدا کی بادشاہت اور مسیح کی بادشاہت میں کچھ فرق نہ تھا اور اِس سے وہ زمانہ مراد لیا جاتا تھا جب آسمان اور زمین ایک ہو جائیں گے۔ جب خُدا اپنے جلال میں منکشف ہوگا۔ جب تمام چیزیں اپنے صحیح معنوں میں ظاہر ہوں گی اور جب مسیح کی بادشاہت جو سچائی اور فروتنی اور راستبازی کی بادشاہت ہے نہ صرف حقیقی ثابت ہوگی بلکہ ظاہر کی جائے گی اور سب پر مسلط ہوگی۔ یہ "دُنیا کا آخر ہوگا" یہ وہ واقعہ ہے جس کی شہادت کلام میں دی گئی ہے اور جو زمانۂ مستقبل سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض اوقات دیدنی کلیسیا کو خُدا کی بادشاہت کہا جاتا ہے۔ لیکن بہت دفعہ (جیسا کہ اِس جگہ اشارہ پایا جاتا ہے) کلیسیا کو وہ الٰہی ذریعہ بتایا جاتا ہے جس پر خُدا کی بادشاہت کی اشاعت منحصر ہے۔ لہٰذا بادشاہت کی آمد و توسیع کے لئے دُعا کرنا گویا کلیسیا کی بہتری اور ترقی کے لئے دُعا کرنا ہے اور سچائی فروتنی اور راستبازی اور اُن تمام دیگر محاسن کی ترقی اور پختگی کی کوشش کرنا ہے جو خُدا کے شہر سے تعلق رکھتی ہیں یا یُوں کہیں کہ ہر قسم کی ابتری اور قانونی خلاف ورزی کے برخلاف دُعا کرنا ہے تاکہ دُنیا سے نفس پرستی۔ لالچ۔ بدزبانی۔ دُنیا داری۔ دروغ گوئی۔ خودنمائی۔ مادہ پرستی۔ ظلم تشدد و حسد وغیرہ اُٹھ جائیں۔

کیونکہ یہ تمام گناہ درحقیقت بغاوت کے گناہ ہیں۔ لیکن یہ بغاوت و سرکشی عارضی ہے اور بادشاہ کی آمد و فتح کا دن نزدیک ہے۔

"تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔"

یہ دُعا ہر قسم کی سرکشی اور سستی کے خلاف ہے اور یہ طلب کرتی ہے کہ تمام ذی عقل مخلوق خُدا کے ساتھ اُن ارادوں اور مقاصد کے پورا کرنے میں تعاون کریں جو وہ اِسی دُنیا کے متعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ "جیسی آسمان پر.... زمین پر بھی ہو" پہلے تینوں فقروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیرا نام پاک مانا جائے۔ جیسے آسمان پر ویسے ہی زمین پر۔ تیری بادشاہی آئے۔ جیسے آسمان پر ویسے ہی زمین پر۔ تیری مرضی پوری ہو۔ جیسے آسمان پر ویسے ہی زمین پر۔ رُومی کلیسیا اُس سوال و جواب کے ذریعہ جسے کونسل آف ٹرینٹ (COUNCIL OF TRENT) نے تیار کیا تھا۔ اپنے خادمانِ دین کو تاکید کرتی ہے کہ وہ کُل ایمانداروں پر اس تعلق کو واضح کریں جو دُعائے ربّانی کے اِن جملوں میں پایا جاتا ہے۔

"ہمارے روز کی روٹی آج ہمیں دے۔"

عہد جدید کے مشکل ترین الفاظ میں سے ایک یہ لفظ ہے۔ جس کا ترجمہ "روز کی" کیا گیا ہے۔ کوئی بھی اس کے صحیح ترجمہ سے واقف نہیں۔ لیکن غالباً اس کا مطلب "آنے والے دن کی روٹی" ہے[1]

---

[1] غالباً مسٹر چیس (CHASE) صاحب (دیکھو صفحہ ۱۳۵) کے ارشاد کے مطابق یہ لفظ لفظ "آج" کے پہلو بہ پہلو اسلئے استعمال ہوا ہے کہ یہ دُعا صبح و شام دونو وقت مانگی جاتی تھی۔ صبح کو مسیحی کہا کرتے تھے۔ "ہماری روٹی آج ہمیں دے"۔ اور شام کو یہ دُعا کیا کرتے تھے "ہماری روٹی کل کیلئے ہمیں دے"۔

اور اس سے یہ مُراد ہے کہ مسیحی خاندان کے تمام افراد کی فوری جسمانی ضروریات مہیّا کی جائیں اور یہ دُعا وہی لوگ مانگ سکتے ہیں۔ جن کی ضروریاتِ زندگی نہایت ہی سادہ اور محدود ہیں اور جب وہ رفع ہو جاتی ہیں تو وہ قانع دل کے ساتھ خُدا کی خدمت انجام دیتے ہیں جو اپنے لئے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں مانگتے جو وہ اوروں کے لئے مانگنے کو تیار نہ ہوں اور جو خُدا سے پیشگی برکتیں طلب نہیں کرتے بلکہ روز کی روٹی روز حاصل کرتے اور اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

"اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے
تُو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر"

یہ سچ ہے کہ ہم خُدا کی خدمت نہیں کر سکتے اگر جسمانی ضروریات مہیّا نہ کی جائیں۔ اسی لئے خُداوند نے روز کی روٹی کے لئے دُعا مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ جب تک خُدا کے ساتھ ہمارا معاملہ صاف نہ ہو تب تک ہم اُس کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے مذکورہ بالا الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گناہ پر ہم مختلف پہلوؤں سے غور کر سکتے ہیں۔ مثلاً گُناہ ہماری فطرت یا ہمارے چال و چلن میں نقص کا نام ہے یا خُدا کے کسی حُکم کی خلاف ورزی ہے (جیسا کہ آیت ۱۴ میں مرقوم ہے) یا جیسا کہ اس جگہ ارشاد ہُوا ہے۔ گناہ وہ فعل ہے جس کے ذریعہ ہم خُدا کے حقوق کی چوری کرتے اور یُوں اپنے ذمّہ ایک ایسا قرض قائم کر لیتے ہیں کہ جس کی ادائیگی کی استعداد نہیں رکھتے۔ لہٰذا ہمیں خُدا کے رحم کا ملتجی ہونا پڑتا ہے۔ پہلی تعریف کے مطابق اصلاح کافی ہے دوسری تعریف

کے مطابق معافی کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ معافی جو اخلاقی طور پر اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہے۔ جب ہماری مرضی پورے طور پر الٰہی مرضی کے تابع ہو جاتی ہے۔ صرف تیسری تعریف کے مطابق وہ معافی حاصل ہوتی ہے جو کسی قسم کا معاوضہ طلب نہیں کرتی۔ لیکن وہ جگہ جو معافی کی درخواست کو اس دُعا میں دی گئی ہے وہ اس غلط فہمی کو دُور کر دیتی ہے کہ الٰہی مرضی کی اطاعت اور خُدا کی بادشاہت کی شراکت کے بغیر بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کیے جا سکتے ہیں۔

اِس درخواست کی تفسیر ہمارا خُداوند خود بدیں الفاظ کر دیتا ہے :-

"اِس لیے کہ اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کرے گا۔ اور اگر تم آدمیوں کے قصُور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصُور معاف نہ کرے گا۔"

یہاں ایک الٰہی اصُول کا ذکر ہے جو اُس تمثیل کے ذریعہ (متی ۱۸/۳۱) واضح کر دیا جاتا ہے۔ جہاں احسان فراموش خادم کا تمام قرض جو معاف ہو چکا تھا۔ پھر واجب الادا قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خود اپنے ہم خدمت کے ساتھ بے رحمی سے پیش آتا ہے اور اُس کا قرض معاف کرنے سے انکار کرتا ہے۔ خُدا ہمارے ساتھ اُسی قسم کا سلوک کرتا ہے جس قسم کا سلوک ہم اپنے ہم جنس انسانوں سے کرتے ہیں۔ وہ ہم کو اُسی نظر سے دیکھتا ہے۔ جس نظر سے ہم دوسروں کو دیکھتے ہیں۔

"اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔"

گو ہم دل میں اس جملہ کا مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اس کے صحیح

معنی بیان کرنا نہایت مشکل ہے۔ مقدّس یعقوب کہتا ہے "اے میرے بھائیو جب تم طرح طرح کی آزمائشوں میں پڑو تو.... کمال خوشی کی بات سمجھنا" ہم کیونکر آزمائش کے برخلاف دُعا کر سکتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ آزمائش یا امتحان ہماری تقویت کے لئے ضروری ہے۔ اس باب میں ہمارے خُداوند کے وہ الفاظ جو جان کنی کی حالت میں شاگردوں سے کہے گئے تھے کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ "جاگو اور دُعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو"۔ اگر آپ غفلت اور بے احتیاطی سے زندگی بسر کرتے ہیں اور جاگنا اور دُعا مانگنا چھوڑ دیتے ہیں تو خُدا سزا کے طور پر آپ کو آزمائش میں پڑنے دیتا ہے اور آزمائش آپ کی تکلیف کا موجب ہوتی ہے۔ لہذا ہم اس دُعا کی یوں تفسیر کر سکتے ہیں۔ ہمیں جاگنا اور دُعا مانگنا سکھا تاکہ ہم آزمائش کے دام میں نہ پھنسیں۔ لیکن اس سے بھی بہتر تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے آپ پر اعتبار نہ کرتے ہوئے خُدا سے محافظت کی درخواست کرتے ہیں۔ ہمارے خُداوند نے بھی اس قسم کی دُعا مانگی۔ جب اُس نے کہا "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے تاہم جیسا میں چاہتا ہوں ویسا نہیں بلکہ جیسا تُو چاہتا ہے ویسا ہی ہو"[1]

---

[1] وہ وقت جو اس جملے کے متعلق ابتدائی مسیحیوں کے سامنے تھی۔ اُس سے اکثر لوگ واقف ہیں دیکھو مسٹر چیس (CHASE) صاحب کی کتاب بنام ابتدائی کلیسیا میں دُعائے ربانی (LORD'S PRAYER IN THE EARLY CHURCH) صفحہ ۷۰ وغیرہ۔ چیس صاحب اُس مشابہت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو دُعائے ربانی کے الفاظ اور خود ہمارے خُداوند کی دُعا کے الفاظ میں جو اُس نے اپنی موت کے وقت مانگی پائی جاتی ہے۔ "باپ تیری مرضی پوری ہو"۔ "دُعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو"۔ اُس شریر سے اُن کی حفاظت کر۔ اسی طرح اِس دُعا میں اور بھی مشابہتیں پائی

"بلکہ بُرائی سے بچا"

یعنی شیطان سے۔ زمانۂ حاضرہ کے لوگ شیطان یا شیطانی آزمائشوں کا یقین نہیں کرتے۔ کسی نے درست کہا ہے کہ "شیطان کی عیاری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے دِل میں اپنی ہستی کے متعلق شکوک پیدا کر دیتا ہے"۔ اور یہ خیال ہماری روحانی کشمکش میں مزاحم ثابت ہوتا ہے اور جب ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بُرے خیالات نہ صرف ہماری اپنی بگڑی ہوئی فطرت کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ بد روحوں کی طرف سے بھی ہمارے دِل میں ڈالے جاتے ہیں تو ہماری مایوسی اور نا اُمیدی بہت بڑھ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہمارا خُداوند ہماری رُوحانی کشمکشوں کی کیفیت سے واقف ہے اور علیم کُل ہے تو شیطانی آزمائشیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ کیونکہ وہ اکثر اُن کا ذکر کیا کرتا تھا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ دُنیا میں بدی اپنا کام کر رہی ہے اور رُوح اور جسم کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے تو اُس کی حقیقت بین آنکھ اُن شیطانی ہستیوں تک پہنچ جاتی ہے جو خُدا کی بادشاہت کے کام کو بگاڑنا چاہتی ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شیطانی رُوحیں جو اس وقت دُنیا میں کام کر رہی ہیں۔ اور انسان کو ستاتی ہیں۔ آخرکار خُدا کے تابع ہو جائیں گی۔ بلکہ اب بھی اُس کے اختیار میں ہیں۔ دُنیا کی بے ترتیبی کے متعلق اُس کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ "کسی دشمن نے کیا ہے" اور وہ ہمیں تاکید کرتا ہے کہ ہم خُدا سے دُعا مانگیں کہ وہ ہمیں اُس شریر سے بچائے۔

---

جاتی ہیں جو یُوحنا ۱۸ میں مرقوم ہے۔ الفاظ "لا" (آزمائش میں نہ لا) اور "پڑو" (آزمائش میں نہ پڑو) ایک ہی فعل کی دو مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

الفاظ "کیونکہ بادشاہی ۔ قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے آمین"۔ دُعا کے آخر میں آتے ہیں۔ اور یہ الفاظ ہماری کلیسیا میں تو دُہرائے جاتے ہیں۔ گو اکثر کلیسیاؤں میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں حقیقت میں یہ اصلی دُعائے ربّانی کا حصّہ نہ تھے۔ گو بہت جلد زائد کئے گئے یہ تمجیدی الفاظ تھے جو ابتدائی کلیسیا میں مستعمل تھے اور اکثر دُعاؤں کے آخر میں بولے جاتے تھے۔ چنانچہ بہت جلد خُداوند کی دُعا کا حصّہ بھی بن گئے اور کئی ایک قدیمی نسخوں میں مرقوم ہیں۔ حقیقت میں یہ خُداوند کی دُعا میں شامل نہیں ہیں۔ کو یہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ باپ کی شکر گزاری اور پرستش کی وجہ بیان کرتے ہیں ۔

اب ہم اُن اصُولوں پر غور کریں گے جو مجموعی طور پر خُداوند کی دُعا میں پائے جاتے ہیں ۔

۱۔ خُداوند کی دُعا منجملہ دیگر دُعاؤں کے ایک دُعا نہیں ہے ۔ جیسے کہ آپ کے پاس کئی ایک کالکٹ ہیں جو مختلف موقعوں کے لئے مقرر ہیں ۔ بلکہ خُداوند کی دُعا تمام مسیحی دُعاؤں کے لئے ایک معیار اور نمونہ ہے۔ "تُم اس طرح دُعا مانگا کرو"۔ جب ہم خُداوند کی دُعا کو سمجھ لیتے ہیں تو ہم پُورے طور پر واقف ہو جاتے ہیں کہ مسیحی کو کیونکر دُعا مانگنی چاہیئے ۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مسیحی ترقی کی انتہائی منزل وُہ ہے ۔ جہاں ہم خُداوند کی دُعا کو اُس طبیعت میں مانگنا سیکھ جاتے ہیں جو طبیعت خود اُس کی تھی ۔ جس کے مُبارک لبوں سے سب سے پہلے وہ دُعا نکلی ۔

اور کلیسیا نے مختلف زمانوں میں اس بات کو پہچانتے ہُوئے خُداوند

کی دُعا کو استعمال کیا ہے۔ انسانی تصانیف میں شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہوگی جو خوبصورتی میں اُن دُعاؤں سے بہتر ہوگی جو مسیحیوں نے خُدا کے مذبحہ پر پیش کی ہیں اور اُن میں مسیح کی قربانی کا واسطہ دے کر خُدا باپ سے مناجات کی ہیں۔ یہ تمام دُعائیں مشرقی کلیسیا کی ہوں یا مغربی کلیسیا کی۔ اس طریق پر تیار کی گئی ہیں کہ عبادت کا اختتام ہر حالت میں خُداوند کی دُعا سے ہوتا ہے۔ اُن تمام نمازوں کی ترتیب میں دُعائے ربانی کو مرکزی جگہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ خُدا کی بہترین عبادت یہی ہے کہ انسان مسیح کی دُعا کے الفاظ کے ذریعہ پوری آزادی کے ساتھ خُدا کے حضور میں آئے اور یہ آزادی ابنِ آدم نے تمام نسلِ انسانی کے لئے اپنے خون سے حاصل کی ہے۔

لہٰذا جب ہم انگریزی عبادت عشاء میں سب سے پہلے خُداوند کی دُعا پڑھتے ہیں تو ایسا کرنے سے ہم اپنے آپ کو عبادت کے لئے تیار کرتے ہیں اور آخر میں جب ہم اُس کے بدن اور خون کی شراکت کے باعث رُوحانی قوت اور آسودگی حاصل کر چکتے ہیں تو پھر خُداوند کی دُعا پڑھتے ہیں اور یوں اُسے اپنی عبادت کی انتہائی منزل قرار دیتے ہیں۔

اِس طرح ہماری صبح و شام کی عبادتوں میں بھی ربانی دُعا پائی جاتی ہے اور اُن دُعاؤں میں بھی جو عقیدہ کے بعد مانگی جاتی ہیں۔ عبادت کے شروع میں خُداوند کی دُعا اس لئے مانگی جاتی ہے کہ وہ ہم میں دُعا کی طبیعت پیدا کر دے اور آخر میں اس لئے کہ اُن تمام دُعاؤں کی نظرِ ثانی ہو جائے جنہیں ہم نے عبادت کے دوران میں پیش کیا ہے بعض

اوقات وقت کی قلت کی وجہ سے دوسری دُعائے ربانی چھوڑ دی جاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ایسا کرنے والے عبادت کی ماہیت اور خداوند کی دُعا کے اصل معنی سے بے خبر ہیں۔

لیکن عام طور پر کلیسیا نے اپنے خداوند کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دُعائے ربانی کو صحیح طور پر استعمال کیا ہے اور جب ہم اُسے آزادی سے استعمال کرنا سیکھ جاتے ہیں تو وہ ہمارے لئے خوشی اور قوت کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ خواہ ہم کسی خاص مضمون کے لئے دُعا کیوں نہ کریں۔ لیکن جب تک ہم اپنے خداوند کے الفاظ اور طبیعت میں ہو کر دُعا نہ کریں گے۔ ہم کبھی درست طور پر دُعا نہ کر سکیں گے۔ اسی لئے مَیں نے شروع میں کہا تھا۔ کہ خداوند کی دُعا منجملہ دیگر دُعاؤں کے ایک دُعا نہیں ہے بلکہ تمام مسیحی دُعاؤں کا مجموعہ ہے اور اس بات کی پرکھ ہے کہ آیا ہماری دُعائیں اس قابل ہیں کہ "مسیح" کے نام میں پیش کی جائیں۔

۲۔ مَیں "مسیح کے نام میں" اس لئے کہتا ہوں کہ خداوند کی دُعا اُسی کے نام میں مانگی جاتی ہے۔ بعض لوگ بچوں کی طرح یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ دُعاؤں کے اخیر میں الفاظ "ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے" استعمال کرنا گویا مسیح کے نام میں دُعا کرنا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ دعائیں مسیح کے نام میں پیش نہیں کی جاتیں۔ مسیح کے نام میں دُعا مانگنے سے یہ مُراد ہے کہ ہماری دُعائیں مسیح کی نمائندگی کریں۔ نمائندہ سے ہمیشہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اُس شخص کی طبیعت میں ہو کر کلام کرے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے اور اُس کے مطلب اور مقصد کی صحیح ترجمانی کرے۔

اگر مسیح ہمارا نمائندہ ہے تو ضرور وُہ ہماری خواہشوں کو ظاہر کرے گا یا کم از کم اُن باتوں کو ظاہر کرے گا جن کی ہم کو خواہش کرنی چاہیئے۔ اسی طرح اگر ہم اُس کے نام میں دُعا کرنے کا دعوےٰ کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم حتی المقدور اُس کی خواہشوں اور ارادوں کے مطابق دُعا مانگیں۔ چونکہ خُداوند کی یہ دُعا اُس کی طبیعت اور مزاج کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ جس کی زبان مُبارک سے یہ الفاظ نکلے اور جس نے اپنی کلیسیا کو سکھائے۔ لہٰذا اِس دُعا کی نسبت پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسیح کے نام میں پیش کی گئی ہے۔ پس اگر آپ یہ دریافت کرنا چاہیں کہ فلاں مقصد کے لئے مسیح کے نام میں دُعا کی جا سکتی ہے یا نہیں تو اِس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر وُہ خُداوند کی دُعا کے کسی حصّے یا جُملے کے مُطابق ہے تو وُہ اُس کے نام میں پیش کیئے جانے کی مستحق ہے۔ ورنہ نہیں۔

۳۔ خُداوند کی دُعا کا جاننا اور مانگنا عقیدہ کے جاننے اور دُہرانے کی طرح ابتدائی کلیسیا میں صرف اُن کا حق سمجھا جاتا تھا جو مسیحی خاندان میں شامل تھے۔ اِس دُعا کے پہلے الفاظ یعنی "ہمارے باپ" اسے ایک خاندانی دُعا بنا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے عقیدے کی یہ تعلیم ہے کہ خُدا کُل نسل انسانی کا باپ ہے اور کہ وہ چاہتا ہے کہ کُل بنی نوع انسان اپنی فرزندیت کو پہچانیں کیونکہ جب تک وہ اس بات سے واقف نہیں ہو جاتے کہ وُہ خُدا کے بیٹے ہیں اور نیز فرزندیت کی ذمہ داریوں کو سمجھ نہیں لیتے۔ وہ کبھی انسانیّت کے قد کے پُورے اندازے تک پہنچ نہیں سکتے۔

لیکن اب چونکہ گناہ نے انسان کو خُدا سے جُدا کر دیا ہے۔ اِس لئے اب فرزندیت کے حقوق کو دوبارہ حاصل کرنا صرف مسیح اور اُس کی پاک رُوح کے ذریعہ ممکن ہے۔ لہٰذا خُدا کو "ہمارے باپ" کہہ کر پکارنے کا صرف وہی حق رکھتے ہیں جنہوں نے رُوح القُدس کے انعام کو حاصل کیا ہے۔ "خُدا نے اپنے بیٹے کا رُوح ہمارے دِلوں میں بھیجا۔ جو ابّا یعنی اَے باپ کہہ کہہ کر پکارتا ہے۔" بعض اوقات ہم خُدا کے باپ ہونے کے متعلّق بڑے اُدنے اور ہلکے تصوّرات قائم کر لیتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ ہم اِس بات کو یاد رکھیں کہ ہم خُدا کو اُسی حالت میں اپنا باپ کہہ سکتے ہیں۔ جب ہم فرزندیت کے فرائض کو انجام دیں اور خُدا کے فرزند صرف وہی ہو سکتے ہیں جو پاک رُوح کی ہدایت کے مطابق چلتے ہیں۔

پس خُداوند کی یہ دُعا کُل مسیحی خاندان کی دُعا ہے۔ یہ دُعا کُل کلیسیائے جامع کی دُعا ہے۔ یہ دُعا ایک ایسی دُعا ہے کہ خواہ اُسے اُس وسیع خاندان کا ایک شریک بھی خاموشی کے ساتھ دُنیا کے کسی گوشے میں مانگے تو بھی اُس میں اُس تمام جماعت کی آرزوئیں تمنائیں اور ضرورتیں پائی جاتی ہیں جو اِس دُنیا کی کُل قوموں۔ اُمتوں اور زبانوں پر مشتمل ہے۔ بلکہ آنے والی دُنیا سے بھی تعلّق رکھتی ہے۔

۴۔ ان درخواستوں کی ترتیب بھی جو خُداوند کی دُعا میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے لئے ایک زبردست سبق رکھتی ہے کیونکہ ہماری دُعاؤں کی مقبولیت بہت درجہ تک اُس ترتیب پر منحصر ہے جو ہماری دُعاؤں کے مضامین میں پائی جاتی ہے۔ ایک مقولہ ہے جسے کلیسیا نے

بہت اہمیت دی ہے اور اُسے مسیح سے منسوب کیا ہے اور گو وہ ہماری اناجیل میں تو پایا نہیں جاتا تو بھی شروع سے کلیسیا کی روایتوں میں شامل سمجھا گیا ہے اور وہ یہ ہے: "بڑی بڑی چیزوں کے لئے درخواست کرو تو چھوٹی چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔ آسمانی چیزوں کے لئے درخواست کرو تو زمین کی چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی"۔ خداوند کی دُعا میں یہی اصول پایا جاتا ہے۔ وہ ہماری درخواستوں کی صحیح ترتیب پیش کرتی ہے۔ وہ سب سے مقدم جگہ بڑی اور آسمانی چیزوں کو دیتی ہے اور بعد میں زمینی اور چھوٹی چیزوں کا ذکر ہے۔ جو ہمیں بہت اہم اور ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

ہمارے لئے اِس ترتیب پر کاربند ہونا بہت مشکل ہے۔ دُنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں۔ جنہوں نے دُعا مانگنے کی عادت کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ لیکن کوئی زبردست فکر یا مصیبت اُنہیں پھر مجبور کرتی ہے کہ وہ خُدا سے التجا کریں۔ شائد اُن کا بیٹا یا بیٹی جان بلب ہے اور والدین جنہوں نے مُدّت سے دُعا مانگنا چھوڑ رکھا ہے۔ اپنی ضرورت کے ہاتھوں مجبُور ہو کر پھر خُدا کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات مختلف قسم کی مصیبتیں ہمیں گھیر لیتی ہیں اور گو ہم مُدت سے دُعا سے بیگانہ ہیں تو بھی خُدا کے سامنے ملتجی ہوتے ہیں کہ وہ اُن مصیبتوں سے جو ہمارا ستیاناس کر دینے کو ہیں مخلصی عنایت کرے۔ اِن حالات میں بھی ہمیں خُدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ لوگ کسی نہ کسی صُورت میں تو اُس سے دُعا کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو ان چیزوں کے ذریعہ بھی جو ہمارے گوشت اور خون سے تعلّق

رکھتی ہیں۔ اعلیٰ چیزوں تک لے جا سکتا ہے اور زمین سے آسمان تک پہنچا سکتا ہے۔ سچا مسیحی سب سے پہلے اُن چیزوں کے لیئے دُعا نہیں مانگتا۔ جو اُس کی شخصیّت سے علاقہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ دُعا جو صرف ہماری اپنی ضروریات سے تعلّق رکھتی ہے وہ درحقیقت مسیح کے نام میں پیش نہیں کی جاتی۔

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے خُداوند نے اپنے شاگردوں سے اپنی مَوت سے پہلے جب وہ بالاخانہ میں جمع تھے۔ فرمایا تھا "اب تک تم نے میرے نام میں کچھ نہیں مانگا۔" اُنہوں نے مختلف قسم کی درخواستیں کی تھیں۔ لیکن سب اپنے نام میں۔ یہی حال اکثر ہمارا ہوتا ہے۔ ہم بہت سی درخواستیں کرتے ہیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی اُس کے نام میں نہیں ہوتی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم جلد اس غلطی کی اصلاح کریں۔ اور اپنی تمام درخواستیں مسیح کے نام میں پیش کیا کریں اور مسیح کے نام میں پیش کرنے سے یہ مراد ہے کہ ہماری درخواستوں میں وُہ ترتیب ہو جو خُداوند کی دُعا میں پائی جاتی ہے۔

اب ہم خُداوند کی دُعا کے مختلف حِصّوں کی ترتیب پر غور کریں گے۔ انسانی جبلّت کے تقاضا کے مُطابق دُعا یُوں شروع ہونی چاہیئے "اے میرے باپ۔ آج مجھے وہ دے جس کی مجھے از حد ضرورت ہے۔" لیکن خُداوند کی دُعا "اے ہمارے باپ" سے شروع ہوتی ہے میرے باپ نہیں بلکہ "ہمارے باپ" سب سے پہلا قدم اپنی خودی کو فراموش کرنا ہے اور اس بات کو یاد رکھنا ہے کہ مَیں خُدا کے بچّوں میں سے صرف ایک فرد ہُوں۔ لہٰذا مَیں کوئی ایسی چیز اپنے لیئے طلب نہیں کر سکتا

جس سے دوسروں کی خوشی اور دلچسپی میں فرق آئے۔ پھر باپ کی صفت یوں بیان کی جاتی ہے۔ "تُو جو آسمان پر ہے"۔ یہ الفاظ خُدا کو واجب التعظیم قرار دیتے ہیں۔ اور ہمیں اُس کے قدموں پر گرا دیتے ہیں۔ خُدا آسمان پر ہے اور تُو زمین پر۔ لہٰذا چاہیئے کہ تیرے الفاظ مختصر ہوں۔ "تیرا نام پاک مانا جائے"۔ یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انسان کی ضروریات میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اُسے خُدا کا مکاشفہ نصیب ہو۔ ہم اکثر خُدا کے جلال اور اُس کی بزرگی کو بھول جاتے ہیں۔ خُداوند کی دُعا ہمیں یہ سکھلاتی ہے کہ ہم اُسے سب سے اوّل اور مقدّم جگہ دیں۔ "تیری بادشاہی آئے"۔ یعنی وہ الٰہی مقصد جسے انسان کی تاریخ میں وقت بوقت اور مختلف صورتوں میں پورا ہونا ہے۔ آخر کار تکمیل تک پہنچے اور جب ہم یہ دُعا مانگتے ہیں تو ہم اپنے ارادوں اور مقاصد سے دست بردار ہوتے ہیں اور خُدا کے ارادوں اور طریقوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

"تیری مرضی جیسی آسمان پر پُوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"۔ اِس جگہ ہم اپنی محدُود اور کوتاہ اندیش مرضیوں کو الٰہی مرضی کے تابع کر دیتے ہیں اور آسمانی قانون کے آگے سر جُھکا دیتے ہیں اور جب ہم خُدا کے جلال کو انسانی ضروریات کے مقابلہ میں مقدّم سمجھنے لگ جاتے ہیں تو اپنے مقاصد اور تجاویز کو خُدا کے بڑے مقصد پر قربان کر دیتے ہیں۔ اور اپنی ادنےٰ مرضیوں کو اُس کی اعلےٰ اور الٰہی مرضی کے تابع کر دیتے ہیں تو اُس وقت ہمیں اجازت دی جاتی ہے کہ اپنی ضروریات کو بھی اُس کے سامنے پیش کریں۔

لیکن یہ درخواستیں بھی نہایت ہی احتیاط اور اعتدال سے پیش کی جاتی ہیں۔ "ہماری کل کی روٹی آج ہمیں دے۔" یہ نہیں کہ ہماری تمام ضروریات رفع کر دے۔ بلکہ ہمیں اتنا دے جس سے ہم تیرا کام تیری مرضی کے مطابق انجام دے سکیں۔ ہمیں اتنا زیادہ نہ دے کہ ہم تو میر ہو جائیں اور دوسرے بھوکے رہیں اور چونکہ ہم خدا کا کام اُس وقت تک انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک کہ ہمارا تعلق اُس کے ساتھ بالکل درست نہ ہو۔ اس لئے ہم اُس سے درخواست کرتے ہیں کہ "ہمارے قرض ہمیں معاف کر۔" لیکن یہ معافی ہمیں خدا کے اُس اٹل قانون کے ماتحت مل سکتی ہے۔ جس کے مطابق خدا ہم سے سلوک کرتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ ہم بھی اُسی قانون کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ پیش آئیں۔ "جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے۔" اور چونکہ ہم کمزور اور خطاکار ہیں۔ اس لئے "ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ برائی (شیطان) سے بچا۔"

دُعا کا تمام فلسفہ خداوند کی اِس دُعا میں پایا جاتا ہے اور جب ہم عمیق نظر سے اس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دُعا کا فلسفہ اور راز وہی ہے۔ جو سائنس کی ترقی کا راز ہے اور جسے فرانسس بیکن صاحب (FRANCIS BACON) نے سب سے پہلے اہلِ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس سے پیشتر انسان نے نجومیوں اور کیمیاگروں کے خود غرضانہ اور حریصانہ جذبات پر عمل کرتے ہوئے فطرت سے ہمیشہ بہترین چیزوں کے حاصل کرنے کی کوشش کی اور چاہا کہ کسی نہ کسی طرح سونا اور آبِ حیات دستیاب ہو جائے۔

لیکن اِنسان اپنی اِن تمام مساعی میں ناکام رہا۔ کیونکہ وُہ فِطرت کے حقیقی قوانین سے ناواقف تھا۔ بیکن صاحب نے ان غلط تصورات کی بدیں الفاظ تردید کی "ہم فطرت پر اُسی وقت حاوی ہو سکتے ہیں۔ جب ہم اُس کی اطاعت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ تب ہم اُس کی نعمتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہی قانون عالم رُوحانی میں بھی کام کرتا ہے اور یہی سبق خُداوند اپنی دُعا کے ذریعہ ہمیں سکھایا چاہتا ہے۔ اس سے پیشتر انسان ہر قسم کی دُعائیں قربانیاں اور مناجات پیش کرتا رہا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ خُدا نے اپنے رحم کے تقاضا کے مطابق اس لاعلمی کی عبادت کو ہمیشہ مشفقانہ نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن تو بھی وہ عبادت ایسی تھی۔ جس میں انسان خُدا کی اصل سیرت اور اُس کے طریقوں سے ناواقف تھا۔ مگر اب ہمارے خُداوند نے جہاں تک ہمارے لئے مفید ہے۔ خُدا کی ماہیت اور اُس کے طریقوں کو ہم پر منکشف کر دیا ہے اور اُس نے ہم پر ظاہر کر دیا ہے کہ دُعا کے حقیقی معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنی خواہشوں اور تقاضوں کو خُدا سے منوائیں بلکہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو خُدا کے بیٹے سمجھتے ہوئے اپنی کوتاہ اندیش عقلوں اور مرضیوں کو ہر وقت خُدا کی کامل دانائی اور مرضی کے مطابق بناتے رہیں اور اُس کے تابع کرتے رہیں اور اُسے ہر حالت میں تمام بنی نوعِ انسان اور کُل کائنات کا باپ سمجھیں۔

اس دُعا میں ہمارے اُن تمام سوالوں کا جواب پایا جاتا ہے کہ کن کن باتوں کے لئے دُعا کرنی چاہیئے اور کن کن باتوں کے لئے دُعا نہیں کرنی چاہیئے۔

یہی جواب ہمارے خُداوند نے ایک اور موقع پر ایک مختلف طریق سے دیا ہے۔ یعنی اپنے صلیبی دُکھوں اور موت کے موقع پر وہ بادشاہت کی آمد کے متعلق دُعا کرتا ہے۔ یُوحنّا نے اِس عجیب و غریب دُعا کو بڑی احتیاط سے رقم کیا ہے۔ اسی طرح وہ اُن ظالم سپاہیوں کے لئے بھی دُعا کرتا ہے جو نادانستہ طور پر اُسے رنج پہنچا رہے ہیں "اَے باپ ان کو معاف کر۔ کیونکہ یہ جانتے نہیں کہ کیا کرتے ہیں"۔ لیکن جب وہ گتسمنی کے باغ میں ہے تو وُہ دُعا کرتا ہے کہ خُدا اُسے اِس جانکنی کی حالت سے بچا لے۔ لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے وہ حقیقی اِنکسار سے کام لیتا ہے اور اُس کی دُعا مشروط ہے۔ "اَے باپ اگر ممکن ہو تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے"۔

خُداوند کی دُعا کا سب سے بڑا سبق یہی ہے۔ کئی ایک چیزیں جو خُدا ہمیں دینی چاہتا ہے۔ ہم پر ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں وہ تمام چیزیں جو اُس کی بادشاہت اور راستبازی سے متعلّق ہیں عنایت کرے گا۔ لہٰذا ہمیں اُن چیزوں کیلئے دُعا کرنی چاہیئے اور چاہیئے کہ ہماری دُعائیں اُس ایمان اور یقین کے ساتھ پیش کی جائیں کہ اگر ہم اصرار اور استقلال سے مانگتے رہیں گے تو اُن برکتوں کو اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے حاصل کر لیں گے۔ اس سے یہ مُراد نہیں ہے کہ ہم دوسروں کی مرضی کو مجبوراً اپنے تابع کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم ایمان کے ذریعہ خُدا کی بادشاہت کی تمام نعمتوں۔ موقعوں اور فائدوں کو اپنے اور دوسروں کے لئے ممکن بنا سکتے ہیں۔

لیکن اِن کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں خُدا

نے ہم پر ظاہر تو کیا ہے۔ لیکن وہ ہمیں دینا نہیں چاہتا اور اُن کے متعلق اُس کے بہت سے قوانین ہیں۔ رُوحانی ہوں یا جسمانی جنہیں اُس نے ہم پر مکاشفہ یا تحقیق کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔ لہذا ہمیں اُن چیزوں کے لئے یا اُن قوانین کے برخلاف دُعا مانگنی نہیں چاہیئے اور نہ ہی ہمیں اس امر کی توقع کرنی چاہیئے کہ خُدا اپنے عام قوانین ہمارے نجی فائدے کی خاطر منسُوخ کر دے گا۔

لیکن مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں۔ جن کے متعلق فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ آیا فلاں فلاں اشخاص کا تندرست ہونا یا فلاں مصیبت کا ٹل جانا خُدا کی مرضی کے مُطابق ہے یا نہیں۔ خُدا ہماری نسبت بہت زیادہ دانا ہے۔ اکثر ہم نہیں جانتے کہ وہ بیّنہ جسے ہم اپنی فصلوں کے لئے نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ خُدا ہمیں دینا چاہتا ہے یا نہیں اسی طرح اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں۔ جن کے متعلق ہماری محدود عقلیں فیصلہ کرنے میں قاصر رہ جاتی ہیں۔ لہذا چونکہ دُعا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم الٰہی مرضی کو انسانی مرضی کے تابع کر دیں بلکہ یہ کہ انسانی مرضی کو خُدا کی کامل مرضی کے مُطابق بنائیں۔ اِس لئے ضرور ہے کہ ہماری دُعائیں ان غیر یقینی اشیا کے متعلق مشروط ہوں۔ اگر ممکن ہو تو فلاں فلاں بات ہو جائے۔ تاہم میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پُوری ہو۔

# باب ہشتم

متی کی انجیل کے چھٹے باب کا لُبِ لباب جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ ہے کہ مذہبی زندگی کا بہترین محرّک جو اُس کے تمام شعبوں اور صیغوں سے تعلّق رکھتا ہو۔ الٰہی مقبولیّت کی خواہش ہے اور یہ محرّک صرف خُدا کو واحد مالک تسلیم کرتا ہے اور صرف اُسی کو قابلِ اعتبار تصوّر کرتا ہے۔ یہ اعتقاد انسان کو دُنیوی تفکّرات سے کامل آزادی عنایت کرتا ہے اور اس خالص محرّک کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے ہمارا خُداوند دُنیا سے علیحدگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے، اور جہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے۔ نہ زنگ۔ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تیرا مال ہے۔ وُہیں تیرا دِل بھی لگا رہے گا۔"

جن دنوں میں یہ الفاظ ہمارے خُداوند نے فرمائے اُن دنوں میں لوگ اکثر اپنے روپیہ اور دیگر خزائن کی محافظت چھپا دینے کے ذریعہ کیا کرتے تھے اور آج کل بھی یورپ کے کئی ایک حِصّوں میں یہی دستور ہے۔ لہٰذا چوروں کو عام طور پر ایسے مکانوں یا کھیتوں میں جہاں خزانے مخفی یا مدفون ہوں۔ نقب لگانے یا

کھودنے کی ضرورت پڑتی تھی اور خُداوند کے اِس استعارہ کا یہی مطلب ہے۔ چنانچہ وہ تاکید کرتا ہے کہ اپنا خزانہ آسمان پر جمع کرو جہاں وہ چوروں کی دست بُرد اور طبعی عناصر کے خراب کُن اثرات سے محفوظ رہ سکتا ہے اور آسمان خُدا کا تخت ہے۔ جہاں اُس کی مرضی سب پر حاوی ہے اور مسیح کی بادشاہت آسمان کی بادشاہت ہے۔ کیونکہ گو وہ دُنیا میں ایک دیدنی جماعت ہے تاہم خُدا اُس بادشاہت میں مرکزی جگہ رکھتا ہے اور اُس کی الٰہی مرضی انسان کی بہتری اور ترقی کے لئے پوری آزادی اور کمال کے ساتھ کام کرتی رہتی ہے۔

لہٰذا اگر ہم سے پُوچھا جائے کہ آسمان پر خزانہ جمع کرنے کا مطلب کیا ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آسمان پر خزانہ جمع کرنا گویا ایسے کام کرنا ہے جو خُدا کی بادشاہت سے علاقہ رکھتے ہیں یا اُس کی ترقی کا مُوجب ہوتے ہیں۔ چُنانچہ ہمارا خُداوند ہمیں یقین دلایا چاہتا ہے کہ ہمارے ہاتھوں کے وہ کام۔ ہمارے دِلوں کے وہ خیالات اور ہمارے لبوں کے وہ الفاظ جن کا مقصد الٰہی بادشاہت کی توسیع ہے۔ خواہ وہ ہماری اپنی شخصی تربیت یا جماعت کی اصلاح سے تعلق رکھتے ہوں۔ خُدا کے بیت المال میں جمع ہوتے جاتے ہیں اور جب وہ آسمانی شہر یعنی نئی یروشلیم ظہور پذیر ہوگی۔ تو ہماری وہ تمام مساعی جو کسی وقت بے سود معلوم ہوتی تھیں۔ اُس ابدی اور جلالی عمارت کی ساخت میں اینٹوں کا کام دیتی ہوئی نظر آئیں گی۔

اس ضمن میں خُداوند اُس مشکل کا بھی حل پیش کرتا ہے۔ جو

اکثر مسیحیوں کو پریشان کیا کرتی ہے اور وُہ مشکل یہ ہے کہ مَیں کیونکر خُدا سے محبّت رکھنے کا اہل ہو سکتا ہوُں؟ مَیں اس امر کی بہت کوشش کرتا ہوُں۔ لیکن باوجود اِس کے مجھے اپنی محبّت کے متعلق شک رہتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں خُداوند فرماتا ہے "کیونکہ جہاں تیرا مال ہے۔ وُہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا"۔ خُدا کی خدمت انجام دو۔ وہ کام کرو اور وہ باتیں کہو جو اُس کی مرضی کے مطابق ہیں۔ اپنے خیالوں اور ارادوں کو خُدا کی طرف لگاؤ۔ اِس کے بعد یقین جانو کہ آہستہ آہستہ قانونِ فطرت کے مُطابق تمہاری جبلّت۔ تمہاری عقل۔ تمہارے جذبات اور تمہارے احساسات غرضیکہ تمہاری تمام شخصیّت وُہی رُخ اختیار کرے گی جو تمہارے اعمال نے کیا ہے۔ جب تم خُدا کے لئے کام کرتے ہو تو گویا اپنی محبّت کو ظاہر کرتے ہو اور اس اظہار کے بعد یقین خود بخود قائم ہو جاتا ہے اور تمام شکوک کافور ہو جاتے ہیں۔

"بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا۔ اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے۔ تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی؟ کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دُوسرے سے محبّت یا ایک سے مِلا رہے گا اور دُوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خُدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"۔

اس جگہ سب سے ضروری اور اہم سوال یہ ہے۔ کیا ہم خُدا کی تلاش میں یکسوئی اور یکجہتی سے مصروف ہیں؟ کیونکہ یکسوئی وہ صفت ہے جو زندگی میں صفائی اور قوّت پیدا کرتی ہے۔ پہلے سادگی اور صفائی کے ساتھ خُدا کو بڑی اور چھوٹی باتوں میں جگہ دو تب تمہاری زندگی قوّت اور نُور سے بھر جائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ یا تو خُدا کو سب سے اوّل اور مقدّم جگہ دینی پڑے گی یا اُسے زندگی سے بالکل خارج کرنا پڑے گا۔ اس امر کی تصدیق کیلئے کسی ایک شخص کی زندگی کا معائنہ کر کے دیکھئے اور جب آپ اُس کے تمام پہلوؤں پر غور کر چکیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُس کی زندگی میں ایک خاص مقصد یا محرّک ہے جو سب سے مقدم جگہ رکھتا ہے۔ اور وہ مقصد یا تو اُسے ہر حالت میں خُدا کی خدمت پر مجبُور کرے گا۔ یا اُس سے وہ کام لے گا جو اُس کے شخصی مفاد اور دُنیوی ترقی کا موجب ہوں گے۔ انسان کے وہ افعال جو اُس سے نازک اور انتہائی حالتوں میں سرزد ہوتے ہیں اُس کی زندگی کے مقصد یا محرّک کا فیصلہ کرتے ہیں اور وہ مقصد یا محرّک اُس کی تمام شخصیّت پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس قسم کا زبردست مقصد زندگی میں ایک ہی ہُوا کرتا ہے اور وہ مقصد یا تو خُدا ہوتا ہے یا دولت۔ لہٰذا چاہیئے کہ آپ اپنی زندگی میں خُدا کو سب سے مقدم جگہ دیں۔ کیونکہ اگر آپ اُسے مقدّم جگہ نہ دیں گے تو اُسے کوئی بھی جگہ نہ ملے گی۔ اگر وہ آپ کی زندگی کے مرکز میں نہیں ہے تو آپ کی زندگی کسی اور مالک کی حلقہ بگوش ہو رہی ہے اور خُدا

کو اُس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

لیکن اس کے متعلّق ہم اعتراض کر سکتے ہیں کہ باقی تمام دلچسپیوں اور مصروفیتوں کو خیرباد کہہ کر صرف خُدا ہی کی خدمت کرنے سے ہماری زندگیاں محدُود و مسدُود ہو جائیں گی۔ خُدا ہرگز ایسا حاسد اور خود غرض خُدا نہیں ہے کہ ہماری جائز آزادی کو ہم سے چھین لے اور ہماری زندگی کی توسیع اور ترقی میں حارج ہو۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خُدا ایک جامع ہستی ہے۔ تمام خوبیوں کا اجتماع اُس میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی خُوبی۔ خوبصورتی یا صداقت نہیں۔ جس سے آپ اُس کی خدمت اور محبّت میں مگن رہتے ہوئے بہرہ ور نہ ہو سکیں۔ بلکہ اُس کی خدمت اور محبّت آپ میں وُہ اہلیّت پیدا کر دے گی کہ آپ خُدا کی بنائی ہوئی دُنیا کی ہر صداقت اور حُسن کا لُطف اُٹھا سکیں۔ انسانی خصلت کی ہر خُوبی کا مشاہدہ کر سکیں۔ اپنے خاندان اور احباب۔ مُلک اور کلیسیا کی خدمت کر سکیں اور تمام بنی نوع انسان کو مستفید کر سکیں۔ ساری چیزیں تمہاری ہیں۔ خواہ پولُوس ہو۔ خواہ اپلُوس۔ خواہ کیفا۔ خواہ دُنیا۔ خواہ زندگی۔ خواہ مَوت۔ خواہ حال کی چیزیں۔ خواہ استقبال کی سب تمہاری ہیں۔ بشرطیکہ تم مسیح کے ہو۔ جس طرح مسیح خُدا کا ہے[1]۔

پس ہمیں ہرگز اس بات سے خائف نہ ہونا چاہیئے کہ خُدا کو مقدّم جگہ دینے اور اُس کی پُوری خدمت کرنے سے ہماری کوئی قابلیّت یا لیاقت مسدُود ہو جائے گی بلکہ برعکس اس کے

[1] ۱۔کرنتھی ۳: ۲۲ و ۲۳۔

ہماری جبلتیں اور قوتیں کمال کی طرف ترقی کرتی چلی جائیں گی۔ اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا۔"

اس جگہ ہمارا خداوند اس بات سے ہمیں متنبہ کر دیتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی وقت تمہاری ضمیر درست حالت میں نہ ہو اور وہ باطنی روشنی تاریکی میں تبدیل ہو گئی ہو۔ بعض اوقات ہم کہا کرتے ہیں کہ ہمارا فرض صرف اتنا ہے کہ ہم اپنی ضمیر کے مطابق چلیں اور اگر ہم اپنی ضمیر کے مطابق چل رہے ہیں تو کسی کا حق نہیں کہ ہماری طرف انگشت نمائی کر سکے۔ لیکن یہ نہایت خطرناک غلطی ہے۔ کیونکہ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم اپنے ضمیر کی اصلاح اور تربیت کریں اور اخلاق اور مذہب کے نور سے اُسے منور رکھیں کیونکہ اس میں بھی اُسی قدر غلطی کا امکان ہے۔ جس قدر ہماری غیر تربیت یافتہ عقلوں میں یا اُسی قدر خامی کا احتمال ہے۔ جس قدر ہماری بصارت میں۔ ممکن ہے کہ اُن دس مجرموں میں سے جو عدالت کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ کثیر التعداد ایسے ہوں جو ارتکاب جرم کے وقت اپنی ضمیر کے مطابق کام کر رہے ہوں۔ کیونکہ اُن کی ضمیریں دیر سے مُردہ ہو چکی ہیں۔ فی زمانہ سب سے زیادہ توجہ اس امر کی طرف دلانی چاہیئے کہ ضمیر صرف ایک قوت ہے۔ جس کے ذریعہ ہم خدا اور اُس کی مرضی سے واقف ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر اُس کی تربیت نہ کی جائے تو وہ ضرور غلط واقفیت بہم پہنچائے گی اور اُس کی تعلیم و تربیت کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اُسے مدرسہ میں ڈالا جائے۔ جہاں "دنیا کا نور" خود اُستاد و معلم ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں

بہت سے عالی قدر اور ذی عزت لوگ پائے جاتے ہیں جن کی باطنی روشنی تاریکی میں مبدّل ہو چکی ہے۔

اگر تجسّس الٰہی میں یکسوئی سے کام لیا جائے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُنیا کے تفکّرات سے کامل آزادی ملے گی۔ اس بات کے آخری حصّہ کا لُبِ لباب اِن الفاظ میں پایا جاتا ہے "تم پہلے اُس کی بادشاہی اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مِل جائیں گی"۔ سب سے پہلے خُدا کی طرف آنکھیں اُٹھاؤ۔ اُس کی اطاعت قبول کرو۔ اُسے اپنے دل کے تخت پر سرفراز کرو۔ وہ تمہارا باپ ہے لہٰذا وہ ہر طرح سے قابلِ اعتبار ہے۔ اگر تم سیدھے سادھے طور پر ہر روز اُس کی مرضی پوری کرتے رہو گے اور اپنی فکریں اُس پر ڈال دو گے تو تم اپنے مستقبل کے متعلق بالکل مطمئن ہو سکتے ہو اور تمہیں وہ اطمینانِ قلب حاصل ہوگا جو "جنگل کے پھولوں" اور "ہوا کے پرندوں" کو حاصِل ہے۔ اِس کے متعلق ہمارا خُداوند یُوں ارشاد کرتا ہے:-

"اِس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ تو بھی تمہارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی

بھی بڑھا سکے ؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو ؟
جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے
ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی میں تم سے
کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت
کے اُن میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس
خُدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی
جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اَے کم اعتقادو تم
کو کیوں نہ پہنائے گا ؟ اِس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم
کیا کھائیں گے ؟ یا کیا پئیں گے ؟ یا کیا پہنیں گے ؟ کیونکہ
اِن سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں اور تمہارا
آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج
ہو۔ بلکہ تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اُس کی راستبازی
کی تلاش کرو۔ تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مِل جائیں گی۔ پس
کل کے لئے فکر نہ کرو۔ کیونکہ کل کا دن اپنے لئے آپ فکر
کر لے گا۔ آج کے لئے آج ہی کا دُکھ کافی ہے۔"

مذکورہ بالا آیات میں خُدا فرماتا ہے کہ ہم کو دنیوی تفکرات سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس سے یہ مُراد نہیں ہے کہ ہم عاقبت اندیشی اور احتیاط سے کام نہ لیں۔ بلکہ ناجائز فکر سے بچے رہیں اور خُدا پر بھروسہ رکھیں۔ روزمرّہ کے فرائض دیانتداری کے ساتھ ادا کریں۔ اور اُن کے انجام کا معاملہ خُدا کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔

خُداوند یسُوع مسیح خود توکّل بر خُدا کا بہترین نمونہ اپنی زندگی سے

پیش کرتا ہے۔ اُس کی تمام زندگی ایک خاص مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف ہوتی ہے اور وہ نتائج کا خیال نہ رکھتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ وہ موقع جبکہ سمندر میں تلاطم برپا تھا اور خُداوند کشتی میں سو رہا تھا۔ اُس کے اطمینانِ قلب پر دلالت کرتا ہے اور زبور ۱۲۷ کے اِن الفاظ کی توضیح کرتا ہے کہ

"تمہیں کچھ فائدہ نہیں جو سویرے اُٹھتے ہو اور آرام لینا
دیر تک موقوف رکھتے اور مشقتوں کی روٹیاں کھاتے ہو
یُوں وہ اپنے پیارے کو نیند دیتا ہے"۔

چاہیئے کہ مذکورہ بالا الفاظ اس تصویر کے نیچے لکھے جائیں جو متلاطم سمندر کی لہروں کے درمیان ہمارے خُداوند کو کشتی میں سویا ہُوا دکھاتی ہے۔

اُن آیات میں جو اُوپر متی کی انجیل سے مقتبس کی گئی ہیں۔ خُداوند حسب عادت ضرب الامثال کی صورت میں کلام کرتا ہے اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے۔ ضرب الامثال کا یہ خاصہ ہے کہ کسی حقیقت کے ایک پہلو کو واضح کرنے کے لئے اُسے انتہائی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا چاہیئے کہ اس حقیقت کو پُورے طور پر سمجھنے اور توازن کو قائم کرنے کی غرض سے ایک ضرب المثل کے ساتھ اُس کی متضاد ضرب المثل پر بھی غور کیا جائے۔ چنانچہ ہمارا خُداوند ایک اور موقعہ پر فرماتا ہے کہ ہمیں اُس شخص کی طرح جو مکان بناتا ہے یا اُس بادشاہ کی طرح جو فوج کشی کرتا ہے مستقبل کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور پیش از وقت اُن تمام مصائب کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے جو اُس کی خدمت میں ہم پر

آئیں گی۔ لیکن ان آیات میں وہ ایک بالکل مختلف تعلیم دے رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اپنی تمام فکریں خُدا پر جو ہمارا باپ ہے ڈال دیں۔ کیونکہ اُسے خود ہماری فکر ہے۔

دیگر مقامات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر صرف اسی ایک مقام پر غور کیا جائے اور بالخصوص اُن استعارات کو ملحوظ رکھا جائے جو جنگل کے پھولوں اور ہوا کے پرندوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو بھی خُداوند کا مطلب صاف طور پر سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ دُور اندیشی کے برخلاف نہیں۔ بلکہ غیر ضروری فکر مندی کے برخلاف تعلیم دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے پودے کی ترقی اور نشو و نما پر لحاظ کیجئے وہ جبلی طور پر مستقبل کی طرف دیکھ رہا ہے اور یُوں بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی نظر ہر وقت بیج کی تیاری کی طرف ہے۔ جس میں اُس کی جنس کے تحفظ اور قیام کا بھید مخفی ہے۔ یہی بات پرندوں میں دکھائی دیتی ہے جب وہ گھونسلے بناتے ہیں تو گویا مستقبل کی تیاری کرتے ہیں۔ پودے اور پرندے دونوں دُور اندیشی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اُن کی دُور اندیشی میں خُدا پر توکل اور اُس کے مقصد کے ساتھ تعاون پایا جاتا ہے۔ جو باتیں وہ نادیدہ اور نادانستہ طور پر کرتے ہیں۔ ہمیں دیدہ و دانستہ طور پر کرنی ہیں۔

ان آیات میں ایک ایسا سبق پایا جاتا ہے جو ہمارے زمانہ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ہم میں سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ ہماری تمام مساعی میں فکر اور عدم اطمینان نظر آتا ہے۔ دُنیا میں کثیر التعداد لوگ ایسے ہیں کہ جن کی جسمانی صحت محض اس وجہ

سے خراب ہوتی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی بیماری کی علامات کے متعلق فکرمند رہتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی نیا مرض نہ لگ جائے اور یہ تشویش اُنہیں اُن کے فرائض کی مناسب ادائیگی سے روکتی ہے۔ چاہیئے کہ ہم اقتضائے عقل کے مطابق محتاط رہیں۔ لیکن ساتھ ہی اِس کے خُدا پر بھروسہ رکھیں اور خوشی اور اطمینان سے زندگی بسر کریں۔

اسی طرح ہماری بہت سی اچھی تجویزیں ناکام رہتی ہیں۔ کیونکہ ہم اُن کی کامیابی کے متعلق بے چین اور حد سے زیادہ متفکر رہتے ہیں اور کبھی اُس اطمینان اور استقلال سے کام نہیں کرتے جو کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "مصروفیت اطمینان اور راحت کی جان ہے"۔

اس قسم کی غلطی بہت سے لوگ اپنی تعطیلات کے متعلق کرتے ہیں۔ وُہ اُنہیں موجبِ سکون و راحت کے بجائے باعثِ بے چینی و بے قراری بنا لیتے ہیں اور اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ تھکی ہاری قوتوں کو آرام صرف اُسی وقت مِل سکتا ہے جب ہم خُدا کی حضوری میں ٹھہریں وہی وہ مقام ہے جہاں ہر قسم کے اضطراب سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اتوار اور دیگر تعطیلات سے لوگ بہت کچھ جسمانی فائدہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ کچھ وقت خُدا کی قربت میں صرف کریں اور اُس آرام کو حاصل کریں جو صرف اُس کے قدموں میں ملتا ہے۔ یہ حقیقت نہ صرف کلیسیا کے عام شرکاء کے لئے ہے۔ بلکہ خادمانِ دین کے لئے بھی

ہے۔ "تھم جاؤ اور جانو کہ مَیں خُدا ہُوں"۔ اس سبق کو سیکھنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔ چاہیئے کہ ہم خُدا پر تکیہ کرتے ہوئے اپنے روزانہ فرائض انجام دیتے رہیں۔ اور ہر روز کے دُکھوں کو مردانہ وار برداشت کرتے رہیں تو ضرور اپنے خُداوند اور آقا کی طرح اُس جلال کو حاصل کریں گے جو خُدا نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے گو ہمیں انتہائی دُکھوں اور صلیب کے تجربہ میں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔

آخر میں اِن الفاظ پر غور کیجئے "آج کے لئے آج ہی کا دُکھ کافی ہے"۔ ہمارا خُداوند ہم سے یہ وعدہ نہیں کرتا کہ اگر ہم خُدا پر بھروسہ رکھیں گے تو ہم دُکھوں سے بالکل رہا ہو جائیں گے۔ بلکہ وہ ہمیں صرف یہ یقین دلاتا ہے کہ "جیسے تیرے دن ہوں ویسی تیری قوت ہو"۔ ہم خُدا کے ہاتھ میں ہیں۔ وُہی ہمیں راحت دیتا ہے اور وہی ہم پر دُکھ آنے دیتا ہے۔ ہمیں اپنے خُداوند کی طرح خُدا کی پدرانہ شفقت پر بھروسہ کرنا ہے اور محنت اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اُس کی محبت اور پروردگاری کے حوالے کر دینا ہے۔

# باب نہم

## مسیحی خاصیتیں

ساتویں باب میں جو پہاڑی وعظ کا آخری باب ہے کئی ایک متعلقہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ خُدا کی بادشاہت کے شہری کی سیرت کی تصویر ہمارے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اُس سیرت کا تعلق پُرانی شریعت کے ساتھ دکھایا جا چکا ہے اور اُس کے بُنیادی اصُول اور محرّک کا بیان کیا جا چکا ہے۔ اب اُن چند خاصیتوں کا ذکر کرنا باقی ہے جو اُس تعلق سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو بادشاہت کے شہری کے خُدا اور انسان سے ہے اور اِن میں سب سے پہلی وہ طبیعت ہے جو عیب جوئی سے مبرّا ہے۔ "عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔"

## عیب جوئی سے پاک طبیعت

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ لُوقا باب ۶ کے مطابق اس نصیحت سے پیشتر خُدا کی سیرت کی تصویر کھینچی گئی ہے اور متی بھی اس تصویر کو اپنے پہاڑی وعظ کے ابتدائی حصّوں میں پیش کرتا ہے۔ تم خُدا تعالےٰ کے بیٹے ٹھہروگے۔ کیونکہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے۔ جیسا تمہارا باپ رحیم ہے۔ تم بھی رحمدل ہو۔ عیب جوئی نہ کرو۔

وغیرہ۔ اِن الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ خُدا عیب جوئی نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کے ساتھ بہترین سلوک کرتا ہے اور اُسے وہ نعمتیں عطا کرتا ہے جن کی قدر وہ کر سکتا ہے۔ یہی خوبی مسیح کے شاگردوں کی طبیعت میں بھی ہونی چاہیئے۔

"عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو۔ اُسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو۔ اُسی سے تمہارے واسطے ناپا جائے گا۔ تُو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا؟ اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تُو اپنے بھائی سے کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ لا تیری آنکھ میں سے تنکا نکال دوں؟ اے ریاکار پہلے اپنی آنکھ میں سے تو شہتیر نکال۔ پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح دیکھ کر نکال سکے گا۔"

غالباً اس وقت ہمارے خُداوند کے پیشِ نظر فریسیوں کی طبیعت اور سیرت ہے۔ فریسی اپنے طور پر مذہب کے پُورے پابند تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک مذہبی ترقی کا معیار دُوسروں پر فتوے لگانے کی قابلیت تھا۔ "یہ عام لوگ جو شریعت سے واقف نہیں لعنتی ہیں"۔ فریسی لوگ گویا مذہب کی انتہائی منزلوں سے گزر چکے تھے۔ یا یوں کہیں کہ وہ تمام مذہبی امتحانات میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اور اب وہ اس قابل تھے کہ باقی تمام لوگوں کو اپنے

سے ادنے درجوں میں متعین کر سکیں۔ اُن کی دانست میں دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کی قابلیّت اُن کی مذہبی ترقی کی کسوٹی تھی۔ لیکن وہ اپنی باطنی سیرت کے اعتبار سے بے پرواہ اور مطمئن رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم مذہب کی انتہائی منزل تک پہنچ چکے ہیں اور درست مذہبی رسُومات کو انجام دے رہے ہیں اور جب تک ہم یہ کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کے اِمتحان کی چنداں ضرورت نہیں۔ لہٰذا فریسی نہ صرف عیب جُو، بلکہ ریاکار بھی تھے۔ یعنی دوسروں کی تو عیب جوئی کرتے تھے اور اپنے متعلّق ریاکاری کرتے تھے۔

ہمارا خداوند یہ نہیں چاہتا کہ اُس کے شاگرد ایک نئی قسم کے فریسی بن جائیں۔ اُسے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ وہ اُس کے احکام پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فریسیوں کی مانند مغرور اور اخلاقی اعتبار سے کمزور ہو جائیں۔ لہٰذا وہ ان دونوں باتوں کے متعلّق جن کا اجتماع بہت ہی آسان ہے۔ اپنے شاگردوں کو متنبّہ کرتا ہے۔

برعکس اس کے خداوند فروتن طبیعت کو پسند کرتا ہے جو دوسروں کے ساتھ تو نرمی سے پیش آئے اور خود اپنے ساتھ سختی کا سلُوک کرے۔ وہ ہم سے گویا یُوں مخاطب ہوتا ہے۔ تم اپنی کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ لہٰذا اپنے آپ کو خوب جانچو اور اُس شہتیر کو جو تمہاری آنکھ میں ہے۔ اچھّی طرح دیکھو اور ایسا کرنے سے تم اپنی نیکیوں کا غلط اندازہ لگانے سے بچے رہو گے۔ اور انکسار اور

---

ا۔ یُوحنّا ۷: ۴۹۔

فروتنی کی طبیعت حاصل کروگے۔ اِس کے علاوہ جب تم اپنی کمیوں سے واقف ہو جاؤ گے۔ تو دوسروں کی نکتہ چینی اور عیب جوئی کی عادت بھی تم میں سے نکل جائے گی۔

الفاظ "عیب جوئی نہ کرو" ہمارے خُداوند کی مُراد یہ ہے۔ کہ ہر ایک کے متعلق خیر اندیش ہونا چاہیئے اور ہمدردی اور خوش اعتقادی سے کام لینا چاہیئے۔ اگر کوئی ایسی بات دیکھتے ہو جو تمہیں عجب معلوم ہوتی ہے یا تمہارے خیالات سے مطابقت نہیں کھاتی تو یک بیک اُس پر فتوے نہ لگا دو۔ بلکہ اُس پر خوب غور کرو۔ اور اُس کی خوبیوں کو دریافت کرنے کی کوشش کرو۔ ہر ایک چیز اور ہر ایک شخص کو اچھی نظر سے دیکھو۔ لیکن اگر کسی تصور یا تحریک یا شخص کے محاسن کے دریافت کرنے کی کوشش کے باوجود بھی تمہیں مجبوراً اُس پر فتوے لگانا پڑتا ہے تو لوگ کم از کم اس خیال سے کہ تم نکتہ چین یا سخت گیر نہیں ہو تمہارے فیصلے کی قدر کرینگے۔ اُس شخص کا فتویٰ کوئی اخلاقی قدر و منزلت نہیں رکھتا جس کا شغل ہمیشہ عیب جوئی کرنا ہے۔

بعض اوقات فتویٰ لگانا بھی مسیحی کا فرض ہوتا ہے۔ مقام زیرِ بحث پر غور کرتے ہوئے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ خُداوند صرف ضرب الامثال کے ذریعہ کلام کر رہا ہے۔ ورنہ شائد ہم اُس کا مطلب سمجھنے میں غلطی کریں۔ اور اس طبیعت کے متعلق جس کی وہ تعریف کر رہا ہے۔ غلط تصور قائم کر لیں۔ فی زمانہ ایک عالمگیر طبیعتِ برداشت کام کر رہی ہے جو ہماری گفتگو اور ادبیات ہر دو میں ظاہر ہوتی

ہے۔ وہ طبیعت ہر بات کو قابلِ برداشت تصور کرتی ہے۔ کیونکہ اِس کے پاس نیک اور بد۔ سچ اور جھوٹ کے امتیاز کا کوئی مستند معیار نہیں ہے۔ لیکن یہ صاف ہے کہ ہمارا خداوند اس قسم کی طبیعت کی تائید نہیں کرتا کیونکہ یہ اُس کی اپنی سیرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ ہمیشہ ضرورت کے وقت بڑی دلیری اور صفائی کے ساتھ نیکی اور بدی میں امتیاز کرتا تھا۔ اور وہ اپنی کلیسیا اور اُس کے تمام شرکاء سے بھی یہی توقع کرتا ہے کہ اُن کے پاس نیکی اور سچائی کی شناخت کے معیار ہوں اور جب فرائض کی ادائیگی مقتضی ہو تو اپنے بھائیوں پر فتوے لگا سکیں۔ متی کی انجیل کا ایک مقام جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے اِس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتا ہے۔ "اگر تیرا بھائی تیرا گناہ کرے"۔ اس حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ کیا یہ کہہ کر ٹال دینا چاہیئے کہ معمولی بات ہے۔ اور میرا کام فتوے لگانا نہیں ہے؟ نہیں اگر ہم عیب جوئی اور سخت گیری کی عادت سے آزاد ہیں اور نیکی و بدی کے قانون کا تحفظ ضروری ہے تو اُس حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم فیصلہ کریں اور صبر اور ہمدردی کے ساتھ فتوے لگائیں۔

"تُو جا اور اکیلے میں بات چیت کر کے اُسے سمجھا۔ اگر وہ تیری سُنے تو تُو نے اپنے بھائی کو پا لیا۔ اور اگر نہ سُنے تو اور ایک دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جا تاکہ ہر ایک بات دو تین گواہوں کی زبان سے ثابت ہو جائے اور اگر وہ اُن کی بھی سُننے سے اِنکار کرے تو کلیسیا سے کہہ اور اگر کلیسیا کی بھی سُننے سے انکار کرے تو تُو اُسے غیر قوم والے اور محصول

لینے والے کے برابر جان۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ جو کچھ تم زمین پر باندھو گے وُہ آسمان پر بندھیگا اور جو کچھ تم زمین پر کھولو گے وہ آسمان پر کھُلے گا۔"[1]

اس جگہ ہمارا خُداوند اپنی کلیسیا کے سپرد باندھنے اور کھولنے کا حق نہیں بلکہ فرض کرتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل اُس نے پطرس کے جو رسُولوں کا نمائندہ تھا سُپرد کیا تھا۔ یعنی یہ کہ مسیحی جماعت اس اَمر کا فیصلہ کرے کہ کونسی باتیں دُرست ہیں اور کونسی غلط۔ کونسی باتوں کی اجازت ہونی چاہیئے اور کونسی باتوں کو ردّ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح وہ اپنی بعثت کے بعد اپنے رسُولوں کو یہ اختیار اور فرض سونپتا ہے کہ اشخاص کے متعلق فیصلہ کریں اور گناہوں کو قائم رکھیں یا معاف کریں[2]۔ لہٰذا کلیسیا اور اُس کے شرکاء کا کام یہ نہیں ہے کہ نکتہ چین بن جائیں اور لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ بلکہ حسبِ ضرورت مسیحی معیار کا تحفظ کریں۔ اسی لئے پولُوس رسول کرنتھس کی کلیسیا کو بڑی وضاحت کے ساتھ بتلاتا ہے کہ مسیحی جماعت ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام فیصلہ کرنا ہے۔ اُن کا نہیں جو تمہاری جماعت کے باہر ہیں۔ بلکہ اُن کا جو تمہاری جماعت کے شرکاء ہیں اور وُہ اُنہیں اِس لئے سخت ملامت کرتا ہے کہ اُنہوں نے ایک زبردست اخلاقی گناہ کی برداشت کی تھی۔ اور فتوے لگائے بغیر اُسے نظرانداز کر دیا تھا۔

یہی بات خُداوند مسیحی تعلیمات کے متعلق طلب کرتا ہے۔ وُہ چاہتا ہے کہ مسیحیوں کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے صحیح معیار ہوں۔ تاکہ

---

[1] متی ۱۸: ۱۵-۱۸ [2] یُوحنّا ۲۰: ۲۳ [3] ۱کرنتھی ۵۔

ساری باتوں کو آزما سکیں اور جو اچھی ہو اُسے پکڑے رہیں[1]۔ اور روحوں کو آزمائیں کہ وہ خُدا کی طرف سے ہیں یا نہیں[2]۔ اور اگر کوئی اُستاد ایسی تعلیم پیش کرے جس سے مسیحی زندگی کے بنیادی اصُولوں میں اختلال واقع ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ امر پولُوس اور یُوحنّا رسُولوں کے حُکم کے مطابق ہرگز قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا۔

"جیسا ہم پیشتر کہہ چکے ہیں۔ ویسا ہی اب مَیں پھر کہتا ہُوں کہ اُس خوشخبری کے سوا جو تم نے قبول کی تھی۔ اگر کوئی تمہیں اَور خوشخبری سناتا ہے تو ملعون ہو"۔

"اگر کوئی تمہارے پاس آئے اور یہ تعلیم نہ دے۔ تو نہ اُسے گھر میں آنے دو۔ اور نہ سلام کرو۔ کیونکہ جو کوئی ایسے شخص کو سلام کرتا ہے۔ وہ اُس کے بُرے کاموں میں شریک ہوتا ہے"۔

مذکورہ بالا ہدایات صرف اُن موقعوں کے لئے ہیں۔ جب مسیحیّت کے اساسی مسلّمات معرضِ خطر میں ہوں۔ فروعات کے متعلّق پولُوس برداشت کی تاکید کرتا ہے[3]۔

اب ایک طرف تو فیصلہ کرنے کا فرض ہے۔ اور دُوسری طرف ہمارا خُداوند عیب جوئی کی طبیعت کو معیوب بتلاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک صاف باطن شخص کے لئے فیصلہ کرنے کے فرض اور عیب جوئی کی طبیعت میں امتیاز کرنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ اور

---

[1] ۱ تھسلنیکی ۵: ۲۱۔ [2] ۱ یُوحنّا ۴: ۱۔ [3] گلاتی ۱: ۹ + ۲۔ یُوحنّا ۱۰۔ ۱۱۔ [4] رومی ۵: ۴ +

برعکس اس کے اکثر وہی لوگ نکتہ چینی اور عیب جوئی زیادہ کیا کرتے ہیں۔ جو خود نیکی اور سچائی کے معیار سے محروم ہوتے ہیں۔

لہٰذا چاہیئے کہ ہم ہمیشہ دوسرے کے ساتھ نرمی اور بھلائی سے پیش آئیں۔ اِس جگہ پھر ہمارا خداوند اس قانون کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ جسے ہم نے اکثر اُس کی زبان مبارک سے سُنا ہے۔ یعنی یہ کہ جس طرح ہم اپنے ہم جنس انسانوں سے سلوک کرتے ہیں۔ اُسی طرح خُدا بھی ہم سے سلوک کرتا ہے۔

"عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو۔ اُسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائے گی۔ اور جس پیمانہ سے تم ماپتے ہو۔ اُسی سے تمہارے واسطے ناپا جائے گا۔"

مذکورہ بالا آیات واضح طور پر بتاتی ہیں کہ خُدا ہم سے کس قسم کا سلوک کرے گا۔ اور لُوقا کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکافاتِ عمل صرف خُدا تک محدُود نہیں ہے۔ بلکہ جیسا ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ وُہ بھی جواب میں ویسا ہی سلوک ہمارے ساتھ کریں گے۔

"عیب جوئی نہ کرو۔ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے گی مُجرم نہ ٹھہراؤ۔ تم بھی مُجرم نہ ٹھہرائے جاؤ گے۔ خلاصی دو تم بھی خلاصی پاؤ گے۔ دیا کرو تم کو بھی دیا جائے گا۔ اچھا پیمانہ داب داب کر اور ہلا ہلا کر اور لبریز کر کے تمہارے پلّے میں ڈالیں گے۔ کیونکہ جس پیمانہ سے

تم ناپتے ہو اُسی سے تمہارے لئے ناپا جائے گا۔"
ہر طرف سے ہمیں وہی ملے گا جو ہم دیں گے۔ اگر ہم لوگوں کے ساتھ تنگدلی اور نکتہ چینی کی طبیعت سے پیش آئیں گے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اُسی طبیعت سے پیش آئیں گے۔ لیکن اگر ہم اُن کے ساتھ نیک سلوک کریں گے تو وہ بھی ہمارے ساتھ نیک سلوک کریں گے۔

## مذہبی حقوق کی تقسیم میں احتیاط

مسیحی طبیعت کی دُوسری خاصیت پہلی سے مختلف نظر آتی ہے اور وہ مذہبی حقوق کی تقسیم میں احتیاط ہے۔

"پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سؤروں کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وُہ اُنہیں پاؤں کے نیچے رَوندیں اور پلٹ کر تمہیں پھاڑیں"

کئی ایک اعلےٰ حقوق ایسے ہیں کہ بہت سے آدمی اُن کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ اور اگر آپ زبردستی وہ حقوق اُن کے گلے مڑھ دیں گے تو ممکن ہے کہ وہ آپ سے بدیں وجہ ناراض ہو جائیں کہ آپ نے ایک بالکل نکمی چیز اُنہیں دے دی ہے اور آپ کے ساتھ بہت سختی سے پیش آئیں۔

جب ہمارا خداوند عیب جوئی کی طبیعت کے برخلاف تعلیم دیتا ہے تو اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ امتیاز کرنیوالی طبیعت

---

۱؎ لوقا ۶: ۳۷-۳۸-

کے خلاف تعلیم دیتا ہے۔ اُن برکتوں کا اندازہ لگانا جو مسیحی کو خُدا کی طرف سے ملی ہیں ناممکن ہے۔ خُدا کی بادشاہت جیسا کہ ہمارے خُداوند نے فرمایا اُس انمول موتی کی طرح ہے جسے کسی آدمی نے پاکر خوشی کے مارے جو کچھ اُس کے پاس تھا سب بیچ دیا اور اُس موتی کو خرید لیا اُسی طرح مسیحی بھی جانتا ہے کہ مسیحی ہونا۔ خُدا کی رفاقت میں داخل کیا جانا۔ اُس کی صداقت کے نُور سے منوّر ہونا اور پاک رُوح کی قوّت کے لباس سے ملبّس کیا جانا کیا ہے اور اُس کی قدر و منزلت کیا ہے اور خُدا کی حضوری کے نُور میں رہتے ہوئے اُسے وہ طاقتِ امتیاز حاصل ہوتی ہے جو اُس کے خُداوند میں بوجۂ احسن موجود تھی۔

دُنیا میں رہتے ہوئے ہمارے خُداوند نے اہلِ دُنیا کو وہ بہترین نعمتیں عنایت کیں۔ جن کے حصُول کی اُن میں اہلیّت پائی جاتی تھی جو جو اُس کی قدرت پر ایمان لاتے تھے وہ اُنہیں شفا بخشتا تھا۔ وہ اُن پر ترس کھاتا تھا اور اُنہیں وُہ برکتیں دیتا تھا جن کی قدر شناسی کی قابلیّت اُن میں موجود تھی۔ یعنی مہربانی اور نیکی۔ لیکن کیا وہ سب آدمیوں کے سامنے اعلےٰ ترین حقیقتوں کو پیش کرتا تھا؟ نہیں بلکہ وہ اُنہیں جانچتا تھا۔ اُن میں امتیاز کرتا تھا اور صرف اُن کے سامنے اعلےٰ حقیقتوں کا بیان کرتا تھا جن کے پاس اُن کے سُننے کے کان ہوتے تھے۔ وہ اپنے موتیوں کو سؤروں کے آگے نہ ڈالتا تھا تاکہ وہ پلٹ کر اُسے پھاڑ نہ ڈالیں۔

لہٰذا چاہیئے کہ ہم لوگوں کے سامنے وہی باتیں پیش کریں۔ جن کی وہ قدر کر سکتے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ خُدا نے ہماری کسی

خوبی کی وجہ سے ہمیں اپنی رفاقت میں جگہ نہیں دی ہے۔ اور دیگر چھوٹی یا بڑی برکتیں بھی ہمیں اُس کے فضل سے حاصل ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اُن کے متعلق بخیل نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اَوروں کو بھی اُن میں حصّہ دار بنانا چاہیئے۔ لیکن اِحتیاط اور اِمتیاز کے ساتھ۔ مہربانی۔ خود انکاری۔ دُوسروں کے مفاد کی نگہداشت اور اُن کی زندگیوں کی محافظت۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں کہ ہر ایک شخص اُن کی قدر کر سکتا ہے۔ لہٰذا چاہیئے کہ اس قسم کا سلوک ہم ہر خاص و عام سے کریں۔ لیکن مذہب کی عمیق ترین حقیقتوں کو ہم سرِ بازار منتشر نہیں کر سکتے۔ بلکہ اُس دولت کو صرف اُنہی کے دامن میں ڈال سکتے ہیں جو اپنی دِلی آرزو کا اظہار کریں۔ مذہبی حقیقتوں اور نعمتوں کی تقسیم میں احتیاط اور اعتدال سے کام لینا چاہیئے۔

ابتدائی کلیسیا اسی اصُول پر کاربند تھی۔ وہ دُنیا کی ہر چہار اطراف میں پھیل گئی۔ اپنی زندگی کے حُسن کو اہلِ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ اپنی اُخوّت کے کمال کو ہر خاص و عام پر ظاہر کیا اور اپنی وسعتِ خیالی کی داد حاصل کی اور لوگوں پر ثابت کیا کہ مسیحی خُدا کے دوست ہیں۔ لیکن اُس نے اُس وقت تک کبھی اپنی زندگی کا بھید۔ عقیدہ۔ پاک عشاء اور دُعا کے اسرار کسی پر ظاہر نہیں کیئے۔ جب تک کہ لوگوں نے تجسّس اور تلاش کا اظہار نہ کیا۔ کلیسیا نے اپنے اعتقادات کی تصدیق اور غیر مسیحی اعتراضات کی تردید ضرور کی ہے۔ لیکن اپنی اندرُونی حقیقتوں کو کبھی ایسے اشخاص پر زبردستی ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی جنہوں نے

عدم دلچسپی کا اظہار کیا ہو۔

لیکن برعکس اِس کے کلیسیا نے کبھی غیر اقوامی مذاہب اور ناسٹک (GNOSTIC) لوگوں کی طرح اپنی زندگی اور تعلیم کو مخفی اور پُراسرار بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ناسٹک (GNOSTIC) لوگ صرف اہلِ ہوش و خرد کو ہی اسرار الٰہی میں شامل کیا کرتے تھے۔ لیکن مسیح کی کلیسیا کا یہ وطیرہ نہ تھا بلکہ وہ ہر ایک کو جو ایمان کے ساتھ اُس کے پاس آتا تھا۔ تعلیم دیتی تھی تاکہ وہ ہر شخص کو مسیح میں کامل کر کے پیش کرے[1]۔ کلیسیا کا یہ ایمان تھا کہ خُدا سے وصال حاصل کرنے کا صرف ایک وسیلہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے گناہ کو محسوس کرے اور خُدا باپ۔ بیٹے اور رُوح القدس پر ایمان لائے۔ اُس کے نزدیک نجات کے لئے صرف اشتہا اور ایمان کی ضرورت ہے۔ اور یہ ہر شخص کے لئے ممکن ہے۔ ہر زمانہ میں وہ یہ بانگِ دہل پکارتی رہی ہے کہ جو پیاسا ہے وہ زندگی کے پانی کے پاس آئے اور اپنی پیاس کو بجھائے۔ لیکن پیاسا ہونا شرط ہے۔

ابتدائی کلیسیا کا یہ طریقہ آج تک صحیح اور بہترین طریقہ ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔ گو اس میں گنجائش ہے کہ ناجائز طور پر استعمال کیا جائے اور فی زمانہ بھی یہی مناسب ہے کہ کلیسیا ہر ایک شخص کے ساتھ لطف و خیر۔ رحم اور مہربانی سے پیش آئے۔ لیکن جبتک کوئی آدمی اُس کے زیر نگرانی و تعلیم خُدا کے بھیدوں سے واقف ہونے کی خواہش ظاہر نہ کرے۔ تب تک یہ باتیں زبردستی بتائی نہ جائیں

[1] کلسی ۱:۲۸ +

اس اصُول کا اطلاق مختلف حالتوں میں مختلف طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات غیر مسیحی ممالک میں انجیل کا پیغام سُنانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات نام نہاد مسیحیوں کو مذہبی تعلیم دینی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات افراد کے اقتصادی تعلّقات کی اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ہر ایک حالت میں کسی نہ کسی صورت میں یہ اصُول ضرور مفید ہوتا ہے۔ کلیسیا کو سب سے زیادہ اس بات میں محتاط رہنا چاہیئے کہ اہلِ دنیا کبھی یہ خیال نہ کریں کہ وہ رُوحانی برکتیں صرف اُنہی کو تقسیم کیا چاہتی ہے جو اُن کے خریدنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ بلکہ اُسے یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ یہ نعمتیں صرف اُن کے لئے ہیں۔ جو اُن سے رُوحانی طور پر مستفید ہونے کی اہلیّت رکھتے ہیں۔

## غیر جانبدارانہ خیر خواہی

مسیحی کو امتیاز سے تو کام لینا چاہیئے۔ لیکن کنجوسی اور تنگ دِلی سے اِحتراز کرنا چاہیئے۔ برعکس اِس کے اِس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ خُدا ہمیشہ ہماری دُعاؤں اور کوششوں کے جواب میں خوشی سے اپنی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ مسیحیوں کو بھی چاہیئے کہ جانبداری سے گریز کرتے ہوئے ہر ایک کے ساتھ فیاضی سے پیش آئیں۔ مسیحی سیرت کی تین خصُوصیّات میں سے یہ آخری ہے۔ جس کے متعلق ہمارا خُداوند تاکید کرتا ہے کہ یہ غیر جانبدارانہ فیاضی خُدا کی سیرت کے علم اور تجربہ سے پیدا ہوتی ہے۔

"مانگو تو تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ

کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے۔ اُسے ملتا ہے۔ جو ڈھونڈتا ہے۔ وہ پاتا ہے۔ اور جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں ایسا کون سا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وہ اُسے پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے۔ تو سانپ دے۔ پس جبکہ تم بُرے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینی جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔ پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں تم بھی اُن کے ساتھ کرو۔ کیونکہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے۔"

لُوقا کے بیان کے مطابق ہمارا خُداوند الفاظ "دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔" کی مفصّل تفسیر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس شخص کی تمثیل پیش کرتا ہے جو بہت رات گئے اپنے پڑوسی کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے اور اپنے ایک دوست کے لئے جو غیر متوقّع طور پر وارد ہو جاتا ہے۔ کھانا طلب کرتا ہے۔ اور خُداوند بتلاتا ہے کہ کس طرح مالک مکان اپنے پڑوسی کے اصرار پر مجبُور ہو کر اُٹھتا ہے اور اُسے کھانا دیتا ہے۔

اِس جگہ خُداوند پھر ضرب الامثال کے پیرایہ میں عام اصُول سِکھاتا ہے کہ اصرار جو مانگنے۔ ڈھونڈنے۔ کھٹکھٹانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ تمام رُکاوٹوں پر فتح پا کر گوہرِ مقصود کو حاصل کر لیتا ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے تو خُداوند بلا امتیاز اور عام طور پر اس اصُول

کو پیش کرتا ہے اور جب وہ لوگوں کی توجہ کو تسخیر کر چکتا ہے۔ تو مختلف موقعوں پر اُن کے استفادہ کے لئے جن کے پاس سُننے کے کان ہیں اِس عام اصُول کی تجدید کرتا ہے اور اُس کے معنی کو متعیّن اور مختص صورت میں پیش کرتا ہے۔ ذیل میں اِس محدود معنی اور مختص تعریف کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ "اِس لئے مَیں تم سے کہتا ہوں کہ جو کچھ تم دُعا میں مانگتے ہو یقین کرو کہ تمہیں مِل گیا اور تمہارے لئے ہو جائیگا"۔ (مرقس ۱۱: ۲۴) "اگر تم مجھ میں قائم رہو اور میری باتیں تم میں قائم رہیں تو جو چاہو مانگو۔ وہ تمہارے لئے ہو جائے گا"۔ (یُوحنا ۱۵: ۱۷) "اب تک تم نے میرے نام سے کچھ نہیں مانگا۔ مانگو تو پاؤ گے"۔ (یُوحنا ۱۶: ۲۴) یہ کہنا کہ تینوں آیات معنی کے لحاظ سے ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں مبالغہ نہ ہوگا۔ مسیح کے نام سے مانگنا گویا اُس کی مرضی کے مطابق مانگنا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے تیسری اور پہلی آیات ہم معنی ہیں اور چونکہ ہم خُدا باپ کے ذی عقل فرزند ہیں۔ اس لئے ہم صرف اُنہیں درخواستوں کے متعلّق یقین کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں مِل گئیں جو خُدا کی الٰہی مرضی کے مُطابق ہیں۔ لہٰذا پہلی آیت دوسری دو آیات کے ساتھ اِتفاق کرتی ہوئی یہ بتلاتی ہے کہ مؤثر دُعا صرف وُہی ہو سکتی ہے جو خُدا کی اُسی مرضی اور سیرت کے ساتھ مطابقت رکھے جس کا مکاشفہ اُس نے اپنے کلام میں کیا ہے۔

حوالہ زیر بحث میں بھی یہی تعلیم نظر آتی ہے۔ ہمارا خُداوند

پوچھتا ہے کہ "تم میں سے ایسا کون سا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا روٹی یا مچھلی مانگے"۔ تو اُسے ایسی چیز دے جو بظاہر مطلوبہ چیز کی مانند ہو۔ لیکن درحقیقت بالکل بیکار یا نفرت انگیز ہو؟ پس اگر اس معاملہ میں انسانی باپ بالکل قابلِ اعتبار نہیں تو ہمارے آسمانی باپ پر تو اور بھی زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ "اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں ضرور دے گا"۔ لیکن اس حقیقت کا ایک دُوسرا پہلو بھی ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی بیٹا اپنے باپ سے ایک ایسی چیز مانگتا ہے جو نقصان دِہ ہے تو اِس حالت میں عقلمند باپ کیا کرے گا؟ وہ ہرگز اپنے بیٹے کو وُہ چیز نہ دے گا۔ بلکہ اُس کی درخواستوں میں سے صرف اُنہیں کو قبول کرے گا۔ جو اُس کی وسیع دانائی کے مطابق ہونگی۔ خُدا بھی اسی طرح کرتا ہے۔ وہ ہماری وہ دُعائیں نہیں سُنتا جو لاعلمی اور جہالت سے مانگی جاتی ہیں۔ بلکہ وُہ دُعائیں سُنتا ہے۔ جو اُس کے پُر حکمت مقاصد کے مطابق ہماری بھلائی کا موجب ہو سکتی ہیں۔ آج تقریباً ہر ایک کلیسیا کے نمائندے رومن کیتھلک ہوں یا انگلیکن۔ مشرقی کلیسیاؤں سے متعلق ہوں یا نانکنفارمسٹ (NON CONFORMIST) اپنے اپنے نکتۂ خیال کے مُطابق کلیسیائی اِتحاد کے لئے دُعا کر رہے ہیں۔ اگر خُدا ہر ایک کی دُعا کا جواب اُن کے حسب خواہش دینے لگے تو نتیجہ یہ ہو کہ ایک جواب دوسرے کے منافی و متضاد ثابت ہو۔ اور ایک دوسرے کے اثر کو زائل کر دے۔ لیکن خُدا ان تمام دُعاؤں کی نیک نیتی پر تو لحاظ کرتا ہے۔ پر اُن کا جواب مانگنے والوں کی درخواستوں

کے مطابق نہیں بلکہ اپنی لامحدود دانائی کے مطابق دیتا ہے۔

اپنی تمثیل کو پیش کرتے ہوئے مقدس لوقا بڑے معنی خیز الفاظ استعمال کرتا ہے "آسمانی باپ اپنے مانگنے والوں کو۔ اچھی چیزیں نہیں بلکہ... روح القدس کیوں نہ دے گا؟"

اکثر کہا جاتا ہے کہ پہاڑی وعظ میں احکام اور تعلیمی مسائل نہیں ہیں۔ لیکن اس میں دو نہایت ہی اہم مسیحی تعلیمات کو کنایتہً پیش کیا گیا ہے۔ یعنی مسیح کی الوہیت اور انسان کی گری ہوئی حالت۔ جیسا ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے اور آگے چل کر مزید غور کرینگے۔ مسیح کی الوہیت اس کے با اختیار کلام کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور انسان کے گناہ کی ہمہ گیری ان الفاظ سے جو گویا ضمناً خداوند کی زبان سے نکلتے ہیں ثابت ہوتی ہے۔ وہ اچھے والدین کا جو اپنے بچوں کو بہترین چیزیں دینا چاہتے ہیں۔ ذکر کرتا ہوا فرماتا ہے۔ "جب کہ تم بُرے ہو کر..." اس کے نزدیک تمام انسان خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ گناہگار ہیں اور روحانی تبدیلی اور نئی زندگی کے حاجتمند ہیں۔ اور جب تک یہ نیا جنم انہیں نہ ملے۔ وہ ترقی کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ جہاں تک خدا انہیں لے جانا چاہتا ہے۔ "پس جبکہ تم بُرے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینی جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا؟"

خداوند الٰہی لطف و کرم کا ذکر کرنے کے بعد نیچتہً ہمارے ان فرائض کو پیش کرتا ہے۔ جو ہمارے ہمجنس انسانوں

سے تعلق رکھتے ہیں۔

پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی اُن کے ساتھ کرو۔ کیونکہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے"

ہمارے اِنسانی تعلقات کو اُس لُطف و مروّت کا عکس ہونا چاہیے۔ جس کا تجربہ ہم نے خُدا کے تعلقات میں جو وُہ ہمارے ساتھ رکھتا ہے کیا ہے۔

خُداوند کے اُن الفاظ میں جو ہمارے اقتصادی فرائض کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کئی ایک غور طلب باتیں ہیں۔

(۱) صلبی صورت میں یہ تعلیم یہودیوں اور یونانیوں دونو کے گوش گذار کی جا چکی تھی۔ "جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ نہ کریں تم بھی اُن کے ساتھ نہ کرو[ل]" لیکن ایک بڑی فوقیت جو ہمارے خُداوند کو دیگر اُستادوں پر حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اُس کی تعلیم ایجابی صورت رکھتی ہے۔ اُس کی خواہش صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ بُرے اعمال سے بچیں بلکہ یہ ہے کہ وہ نیک اعمال میں مصروف رہیں۔

(۲) یہاں بھی خُداوند اپنی عادت کے مطابق ضرب الامثال

ل اس جگہ ہلل (HILLEL) کے مقولہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے یہ الفاظ ہیں۔ "جو باتیں تیری نظر میں نفرت انگیز ہیں تُو اپنے پڑوسی کیلئے بھی اُنہیں نفرت انگیز سمجھ۔ اصل شریعت اتنی ہی ہے۔ باقی سب اُس کی تفسیر ہے"۔ فلاطون کی تعلیم میں بھی ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو سٹوئکی لوگوں میں رائج ہیں۔

کے ذریعہ کلام کرتا ہے۔ لہذا چاہیئے کہ اُس کے فرمان کی لفظی طور پر تفسیر نہ کی جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہر ایک یہ ہی چاہے گا کہ لوگ ہر بات میں میرے ساتھ اتفاق کریں۔ جس چیز کو مَیں چاہوں وہ بھی اُسے چاہیں اور جس سے مَیں نفرت کروں۔ وہ بھی اُس سے نفرت کریں۔ حقیقت میں مسیح کا مطلب یہ ہے کہ جس مُروّت اور فیاضی کی ہم دُوسروں سے توقع کرتے ہیں۔ ہم بھی اُس مُروّت اور فیاضی سے اُن کے ساتھ پیش آئیں۔

(۴) اس جگہ مسیحی اقتصادی فرائض کا نچوڑ پایا جاتا ہے۔ عمانوایل کینٹ (EMMANUEL KANT) نام فلسفی نے ذیل کے الفاظ میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا تھا۔

"انسان کو خواہ وہ تم خود ہو یا کوئی اور ہو کبھی محض ایک وسیلہ یا ذریعہ سمجھنا نہ چاہیئے۔ بلکہ ہر حالت میں اُسے ایک غایت سمجھنا چاہیئے۔" تمام بنی نوع انسان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہیئے گویا کہ وہ ہماری تمام مساعی کا مقصد اور نصب العین ہیں نہ یہ کہ ہمارے مقاصد کے حصول کے لئے ذرائع ہیں۔ خواہ وہ مقاصد توسیع نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ آرام و آسائش سے متعلق ہوں۔ یا طرب و نشاط سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس فلسفیانہ حقیقت کو ہمارا خُداوند زیادہ سادہ اور عملی طور پر پیش کر رہا ہے اور بتاتا ہے کہ ہمیں اسی طرح دوسروں کے فائدہ کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ جس طرح ہم اُن سے توقع کرتے ہیں اور کبھی اپنے لئے مستثنیات نہ بنانی چاہئیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے پڑوسی

سے اپنی مانند محبت رکھیں اور ہمیشہ اس بات کو یاد رکھیں کہ خدا کے سلوک میں کسی قسم کی جانبداری کو دخل نہیں۔ مسیحی اقتصادی تعلقات کا یہی اصول ہے اور یہ اصول انصاف اور مساوات پر مبنی ہے۔ اگر اس اصول کے اطلاق کی تفصیل پیش کی جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں اور پھر بھی وہ سلسلۂ تکمیل تک نہ پہنچے۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسیحی جماعت اب تک پورے طور پر اس اصول پر کاربند نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے اس امر کے متعلق تو کم و بیش صحیح تصورات قائم کر لئے ہیں کہ ہماری انسانی زندگی کیونکر بسر ہونی چاہیئے۔ ہماری قوتوں کی نشوونما کے لئے کس قسم کا ماحول ہونا چاہیئے۔ ہماری انفرادی اور خاندانی ترقیوں کے نکتۂ خیال سے گھر۔ مدرسہ اور کالج۔ شباب۔ شادی شدہ زندگی اور پیری۔ محنت و آرام کیا قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمیں ان تصورات کو عالمگیر بنانا ہے اور اپنی خواہشات اور مطالبات کی بدیں غرض تجدید کرنا ہے کہ جو کچھ ہم اپنے لئے مفید و ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ دوسروں کو بھی دستیاب ہو سکے۔ ہمیں غیر جماعتوں اور افراد کی بہتری اور ترقی کی اُسی قدر کوشش کرنی چاہیئے۔ جس قدر ہم اپنی جماعت۔ خاندان یا خود اپنے لئے کرتے ہیں۔ جو خدمات ہم دوسروں سے طلب کرتے ہیں۔ ہمیں بھی حقیقی معنوں میں اُن کے لئے انجام دینی چاہئیں۔ لیکن جانبداری سے بچنا چاہیئے۔ اس امر سے یہ مُراد نہیں کہ جو امتیاز اہلِ دُنیا میں مرتبہ۔ دولت یا

قابلیت کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ اُسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ کیونکہ ضرورتوں اور لیاقتوں کے اعتبار سے قدرت نے یہ فرق ضرور رکھا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی نیکی اور خیر خواہی کی دولت کو مساوی تقسیم کریں۔

(۴) ہمارے خُداوند کے فرمان کے مطابق "توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے"۔ یعنی یہ وہ اصُول ہے۔ جو پُرانے عہد نامہ کی تعلیم کی رُوح رواں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پُرانے عہد نامہ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس انجیلی تصوّر کے اعلےٰ معیار تک نہیں پہنچتیں اور ہمارا خُداوند اپنے پہاڑی وعظ کا ایک بڑا حصّہ اُن ہی باتوں کی توضیح کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ان باتوں میں مسیحی شریعت مُوسوی شریعت پر سبقت لے جاتی ہے۔ لیکن پُرانے عہد نامہ کی تعلیم میں تدریجی ترقّی نظر آتی ہے۔ اور اِس جگہ آ کر وہ اپنی انتہائی منزل کو پہنچتی ہے۔ چنانچہ پولُوس فرماتا ہے۔ "اور اُن کے سوا اور جو کوئی حکم ہو ان سب کا خلاصہ (با تکمیل) اس بات میں پایا جاتا ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبّت رکھ[۱]"۔

---

[۱] رومیوں ۱۳ : ۳۔

# باب دہم

## آخری تنبیہات

پہاڑی وعظ کے اختتام پر ہمارا خداوند تین باتیں بڑے زور کے ساتھ بطور آخری انتباہ کے پیش کرتا ہے اور اُن کا مطلب یوں ادا ہو سکتا ہے۔ زندگی میں دو راہیں ہیں۔ ایک راہ آسان ہے جو خود پرستی کی راہ ہے اور دوسری راہ مشکل راہ ہے جو خود انکاری کی راہ ہے۔ کثیر التعداد لوگ ایسے ہیں جو پہلی راہ پر گامزن ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو دوسری راہ پر چلتے ہیں۔ یہ دونو راہیں بالکل مختلف سمتیں اختیار کرتی ہیں۔ اوّل الذکر تو موت کی طرف لے جاتی ہے اور مؤخر الذکر زندگی کی طرف۔

دُنیا میں بہت سے اُستاد ہیں جو اچھی تعلیمیں دیتے ہیں۔ لیکن ابن آدم اِنسانوں کی عدالت اُن کے الفاظ یا اُن کی مساعی کے ظاہری نتائج کی بنا پر نہیں بلکہ اُن کی سیرت کی بنا پر کرے گا۔

فی زمانہ بہت سی روحانی عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں اور سب دیکھنے میں خوبصورت اور خوشنما ہیں۔ لیکن اُن کی اصل پہچان اِس بات میں ہے کہ آیا وہ دیرپا ہیں یا نہیں۔ کوئی عمارت جو ابن آدم کی تعلیم کے علاوہ اور کسی بنیاد پر اُٹھائی گئی ہے۔ اُن صدموں اور حادثوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو وقتاً فوقتاً واقع ہوتے رہتے

ہیں۔ اب ہم اُن تینوں تنبیہات میں سے ہر ایک پر غور کرینگے۔

## زندگی کی دو راہیں

"تنگ دروازہ سے داخل ہو۔ کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے۔ اور اُس سے داخل ہونے والے بہت ہیں۔ کیونکہ وہ دروازہ تنگ ہے اور وہ راستہ سکڑا ہے۔ جو زندگی کو پہنچاتا ہے اور اُس کے پانے والے تھوڑے ہیں"۔

یہ "دو راہوں کی تعلیم" کہلاتی ہے۔ انسانی جبلت نے دُنیا کے مختلف حصّوں میں اِس استعارہ کو جاذب اور پُر کشش پایا ہے۔ یعنی خود پرستی کی آسان راہ اور خود انکاری کی کٹھن راہ۔ یہ اِستعارہ عام فہم ہے اور ہر دل اور ہر ضمیر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن مَیں آپ کی توجہ ایک سوال کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو ہمارے زمانہ میں اِن الفاظ کے پڑھتے ہی بپا ہوتا ہے۔ کیا ہمارے خُداوند کا یہ مطلب ہے کہ آخری فیصلے کے مطابق دُنیا کا بیشتر حصّہ ہلاک ہوگا اور معدودے چند "زندگی" کو حاصل کرینگے؟ کیا الفاظ "اُس کے پانے والے تھوڑے ہیں"۔ کا یہی مفہوم ہے؟

اِس سوال کا جواب یُوں دیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ شاگردوں نے خُداوند سے پُوچھا "کیا نجات پانے والے تھوڑے ہیں"؟ اُس نے اُن کے جواب میں کہا "جانفشانی کرو۔ کہ تنگ دروازے سے داخل ہو"۔ ایک اور موقعہ پر پطرس نے یُوحنّا

کے متعلق دریافت کیا۔ "اَے خُداوند۔ اِس کا کیا حال ہوگا"؟ اور اُسے یہ جواب مِلا۔ تجھ کو کیا؟ تُو میرے پیچھے ہولے[۱]۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہمارا خُداوند اُن سوالات کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ جنہیں اِنسان کا تجسّس آخرت کے متعلق برپا کرتا ہے۔ بلکہ وہ ہماری توجہ کو تین بڑے اصُولوں کی طرف منعطف کراتا ہے۔ یعنی (۱) خُدا باپ کی ریسیرت۔ اُس کی غیر جانبدارانہ اِنفرادی اور تادیبی محبّت۔ (۲) اُس کی بادشاہت کی آخری اور عالمگیر فتح تمام اندرُونی اور بیرُونی رُکاوٹوں پر (۳) ہماری موجودہ زندگی کی اہمیت بلحاظ نیکی و بدی کی استعداد کے جو اُس میں پائی جاتی ہے اور وہ لامحدُود نیک یا بد نتائج جو ہماری شخصی ذمہ واریوں کی ادائیگی یا پہلوتہی سے مرتب ہوتے رہتے ہیں۔

ہم اپنے خُداوند کے الفاظ کا ترجمہ اس طرح بھی کر سکتے ہیں "بہت سے ہیں جو کُشادہ راستے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور کم ہیں جو سُکڑے راستے کو پار رہے ہیں" اور کُل انسانی تجربہ اِس بات کی حقیقت کی شہادت دیتا ہے۔ اُس شخص پر جو اپنے فرائض کو انجام دیا چاہتا ہے۔ کسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُسے اس زندگی کی دوڑ میں تنہا دوڑنا ہے۔ یا کم از کم اکثریت کے خلاف کھڑے ہونا ہے۔ وہ دُوسروں کی ذُمہ واریوں اور سہولتوں کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مگر وہ اتنا جانتا ہے کہ خُدا جو رحیم ہے وہ ہر مخلوق کے ساتھ انتہائی درجہ کی عنایت اور شفقت کا

---

[۱] لُوقا ۱۳: ۲۳-۲۹ + یُوحنّا ۲۱: ۲۱-۲۲-

سلوک کرتا ہے اور وُہ اپنے فرائض اور ذمہ واریوں سے واقف ہے اور اُسے معلوم ہے کہ اُن کی انجام دہی کی راہ میں بہت کم لوگ اُس کے ہمسفر ہوں گے۔ زیادہ لوگ ایسے ہوں گے جو بدی کی راہ میں گامزن نظر آئیں گے۔ اور یہ منظر اُس کے لئے نہایت ہی حیرت ناک اور مایوس کن ثابت ہوگا۔

## نیک سیرت کی ضرورت

"جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں۔ مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں۔ اُن کے پھلوں سے تم اُنہیں پہچان لوگے۔ کیا جھاڑیوں سے انگور یا اُونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے۔ اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا۔ نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے۔ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا۔ وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ پس اُن کے پھلوں سے تم اُنہیں پہچان لوگے۔ جو مجھ سے اَے خُداوند اَے خُداوند کہتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا۔ مگر وُہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ اُس دن بہتیرے مجھ سے کہینگے اَے خُداوند اَے خُداوند۔ کیا ہم نے تیرے نام سے

بد روحوں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سے
معجزے نہیں دکھلائے؟ اُس وقت میں اُن سے صاف
کہہ دُوں گا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اَے
بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ"

ہمارا خُداوند ہمیں سب سے زیادہ ریاکاری کے برخلاف متنبہ کرتا ہے۔ اہلِ فرانس اور جرمنی عام طور پر خیال کرتے ہیں۔ کہ انگریز لوگ ریاکار ہُوا کرتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا دعوےٰ کرتے ہیں جن پر عمل نہیں کرتے۔ مذہب کی ظاہری باتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اندرُونی باتوں کے متعلق غافل رہتے ہیں۔ خواہ یہ اعتراض ہمارے متعلق دُرست ہو یا نہ۔ لیکن یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی زندگیوں پر غور کریں۔ آج کل ادبی و اخباری دُنیا میں سیاسی و مذہبی دُنیا میں بہت سے نبی۔ اُستاد اور مُصلح پیدا ہو رہے ہیں جو نہایت ہی مرغوب و مقبول باتیں کہتے ہیں۔ اور اپنی مساعی میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ وہ شبانہ روز گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ "کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے بدرُوحوں کو نہیں نکالا۔ اور تیرے نام سے بہت سے معجزے نہیں دکھائے"۔ لیکن اُن کی تمام فصاحت۔ اُن کی تمام کامیابی نیک سیرت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ ہمارا خُداوند ہم میں اسی خوبی کو دیکھنا چاہتا ہے اور وہ ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ اگر ہم میں وہ اندرُونی سیرت جو مسیح کی طرح ہے۔ موجود نہ ہوگی تو ہماری تمام کامیابیاں بیکار ثابت ہوں گی۔

اِن دِنوں میں جبکہ اہلِ دُنیا میں کارہائے خیر کے متعلق ایک نہایت ہی وسیع اور غیر متعین سا تصور پایا جاتا ہے۔ بے قراری اور عدم سکون نظر آتا ہے۔ نتائج اور کامیابی کے بارے میں غایت درجہ کی فکرمندی ہے۔ خُداوند کا یہ فرمان ایک زبردست اِنتباہ کا کام کرتا ہے۔ آج کل اس آگاہی کی بہُت ضرورت ہے جبکہ اخباری کوششوں کی گرم بازاری ہے۔ جبکہ ہر شخص اپنی تشہیر چاہتا ہے اور ہر ایک بات پیش از وقت دُنیا کی آنکھوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مسیح کے خادمان بھی بعض اوقات حد سے زیادہ فکرمند ہو کر ایسے دیدنی نتائج کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ایک پُرکشش صورت میں مُرتب ہو کر کلیسیائی رسالوں یا عام اخباروں میں شائع کئے جائیں۔ چاہیئے کہ ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ اگر یہ باتیں اندرُونی مسیحی سیرت کا اظہار نہیں ہیں تو ہمارے خُداوند کی نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اُس کے نزدیک محض وُہی اعمال قابلِ توقیر ہیں۔ جن میں وُہ خود اپنی سیرت کی مشابہت دیکھتا ہے۔

آیاتِ زیرِ بحث میں دو اور ضروری باتیں ہیں جو بعض اوقات نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا خُداوند ہمیں یقین دلانا چاہتا ہے کہ جہاں کہیں نیک سیرت یا مسیح کی سیرت کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہاں پاک روح بھی ضرور موجود و مشغول ہے۔ خُدا اپنے مقرر کردہ ذرائع کے علاوہ اور صورتوں میں بھی کام کرتا ہے۔ ہم جو اُس کی مرضی

سے واقف ہیں۔ وفاداری اور فرمانبرداری کی وجہ سے اُس کے مقرر کردہ ضابطوں اور ساکرامنٹوں پر کاربند ہیں۔ لیکن اُس کی قُدرت اِن ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ جہاں کہیں وہ نیک طبیعت پاتا ہے۔ اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم کسی شخص میں مسیحی سیرت کی تعمیر اور ترقّی کے نشانات پاتے ہیں تو اُس زندگی میں رُوح القدُس کی موجودگی اور اُس کے کام کے متعلّق شک کرنا کُفر سے کم نہ ہوگا۔ اچھا پھل صرف اچھے درخت سے ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ ہم اُس دعوے پر غور کریں جو خُداوند اپنے متعلّق کرتا ہے۔ بغیر کسی تمہید یا تاکید کے۔ بلکہ بڑی سادگی کے ساتھ وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کا مُنصف ہے اور کہ یہ انصاف نہ صرف اُن کے ظاہری اعمال سے تعلّق رکھتا ہے۔ بلکہ اُن کی اندرونی و دِلی نیتوں اور زندگیوں سے متعلّق ہے۔ اُس دن (یعنی یہوواہ کے دن" آخری حساب کے دن) بہتیرے مُجھ سے کہیں گے۔ "اَے خُداوند۔ اَے خُداوند" اور یُوں اپنی اطاعت کا اظہار کریں گے۔ اور اپنے نیک کاموں کا ذکر کریں گے۔ لیکن مَیں اُن کے دعوؤں اور اندرُونی سیرتوں میں امتیاز کرونگا" ہمارے خُداوند کے زمانہ میں مُلک فلسطین میں بہُت سے یہودی تھے جو یہ مانتے تھے کہ ابن آدم یا مسیح موعُود "عدالت کے دن" یعنی "دُنیا کے آخر میں" خُدا کا قائم مقام ہو کر عدالت کا کام کریگا۔

چنانچہ جب خداوند یہ بتاتا ہے کہ وہ دُنیا کی عدالت کرے گا۔ تو گویا اپنے آپ کو مسیح موعود ثابت کرتا ہے۔ لیکن وُہ اِس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور دعوئے مسیحیائی میں ایسے عمیق اور گہرے معنی داخل کرتا ہے۔ کہ وُہ دعوئے دعوئے خُدائی بن جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص شاگردوں کی طرح دن رات ایک ایسے شخص کے ساتھ رہے۔ جسے وہ اپنے بیرونی اعمال اور اندرُونی خیالات کا فیصلہ کرنے والا سمجھے۔ اپنی زندگی اور مستقبل کا واحد اور آخری مُنصف تصوّر کرے۔ لیکن اُس کی تعظیم و تکریم اور پرستش کے لئے تیار نہ ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ اگر وہ معبودِ حقیقت میں ایک الٰہی ہستی نہ ہو تو یہ تعظیم و پرستش بُت پرستی اور صنم پرستی سے کم نہ ہوگی۔

اسی طرح ماننا پڑتا ہے کہ وہ شخص جو تمام بنی نوع انسان کی اندرُونی کیفیتوں کے جاننے اور اُن کا فیصلہ کرنے کا دعویدار ہو وہ یا تو پرلے درجے کا کافر (خُدا معاف کرے) یا سچ مچ خُدا کا بیٹا اور باپ کا حقیقی جوہر ہے۔

## بقا بہترین کسوٹی ہے

آخر میں ہمارا خُداوند اِس امر کے متعلق بھی ہمیں آگاہ کیا چاہتا ہے کہ ہر ایک رُوحانی عمارت کا فیصلہ اُس کی پائیداری کے لحاظ سے کیا جائے گا۔

"پس جو کوئی میری باتیں سُنتا اور اُن پر عمل

کرتا ہے۔ وہ اُس عقل مند آدمی کی مانند ٹھہریگا
جس نے چٹان پر اپنا گھر بنایا اور مینہ برسا اور
پانی چڑھا اور آندھیاں چلیں اور اُس گھر پر
ٹکریں لگیں۔ لیکن وُہ نہ گرا۔ کیونکہ اُس کی بُنیاد
چٹان پر ڈالی گئی تھی۔ اور جو کوئی میری یہ باتیں
سُنتا ہے اور اُن پر عمل نہیں کرتا۔ وُہ اُس
بے وقوف آدمی کی مانند ٹھہرے گا۔ جس نے
اپنا گھر ریت پر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا
اور آندھیاں چلیں اور اُس گھر کو صدمہ پہنچایا اور
وہ گر گیا اور بالکل برباد ہو گیا"

اِن آیات میں بھی ایک زبردست دعوے پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ صرف یسوع مسیح اور اُس کی تعلیم زندگی کی مُحکم بنیاد ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ خُداوند اپنی کلیسیا کو قائم کرتے وقت مذکورہ بالا دونوں باتوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر رُوحانی عمارت کی بنیاد چٹان پر ہونی چاہیئے اور کہ یہ چٹان صرف اُس کی اپنی شخصیت اور تعلیم ہے۔ شروع ہی میں ایک بڑی جماعت اُس کے پیچھے ہو لیتی ہے۔ اور اُسی قسم کی بیعت اختیار کرنا چاہتی ہے۔ جو عوام جوش اور خروش کے موقعوں پر مذہبی ہادیوں اور مُحسنوں کی اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ اُن معجزوں کو دیکھ کر جو وُہ دکھاتا تھا۔ اُس کے نام پر ایمان لائے۔ ہمارا خُداوند اُن سے علیحدہ رہتا تھا۔ چنانچہ یوحنا یہ بھی بتاتا ہے

لیکن یسوع مسیح اپنی نسبت اُن پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ اِس لئے کہ وہ سب کو جانتا تھا اور اس کی حاجت نہ رکھتا تھا۔ کہ کوئی اِنسان کے حق میں گواہی دے۔ کیونکہ وہ آپ جانتا تھا۔ کہ اِنسان کے دل میں کیا کیا ہے[1]۔ غرض وہ اُن سب کو جو اُس کی شاگردی اختیار کرنے کا دعوےٰ کرتے تھے۔ اپنی علیحدگی پسند طبیعت۔ اپنے سخت الفاظ اور اپنی حیرت افزا باتوں سے آزماتا تھا اور اُن کو جو حقیقت میں اُس کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ تماشبینوں سے جُدا کر لیتا تھا اور ایسا کرنے میں وہ محض کثرتِ تعداد کو کبھی اہمیت نہیں دیتا۔ آخر کار وہ ایک چھوٹے سے گروہ کو منتخب کر لیتا ہے جو صدق دلی سے اُس کی پیروی و اطاعت کرتے ہیں اور اُس کے رسول کہلاتے ہیں۔ یہ سچ مچ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے چٹان پر بنیاد قائم کر لی ہے اور اُسی پر اپنی زندگی اور خدمت کی عمارت اُٹھا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اُس پر اور اُس کے قول پر پُورا بھروسہ رکھتے ہیں اور اُس کے نام کے اقرار کو اپنی زندگی کی بنا سمجھتے ہیں اور جس طرح اُن کی بنیاد چٹان کی طرح اٹل ہے۔ اُسی طرح وہ خود بھی مضبوط اور مستقل نظر آتے ہیں اور عام اِنسانی فطرت کے تلوّن اور عدم استقلال سے جو مثل ریت کے ہے مبرّا ہیں۔ لہٰذا خُداوند اُنہیں چُن لیتا ہے اور اُنہیں اپنی نئی سماج کی بُنیاد مقرر کرتا ہے۔ اور

[1] یُوحنّا ۲: ۲۳-۲۵۔

ایسے حالات کے درمیان جب کہ اُن کی عقیدت و وفا کا سخت اِمتحان ہو رہا ہے۔ وُہ اہم ترین سوال پُوچھتا ہے۔ جس کا جواب پطرس نے بدیں الفاظ دیا۔ "تُو زندہ خُدا کا بیٹا مسیح ہے۔" یہ جواب سُن کر خُداوند کو اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اور پطرس کے لئے اُس کی زبانِ مُبارک سے وہ کلمات برکت نکلتے ہیں۔ جن میں اِس امر کا اعتراف پایا جاتا ہے کہ پطرس میں وہ خوبیاں موجُود ہیں۔ جو اُس کی کلیسیا کی راہنمائی کے لئے ضروری ہیں۔

"مُبارک ہے تُو شمعُون برےُونا۔ کیونکہ یہ بات گوشت اور خون نے نہیں۔ بلکہ میرے باپ نے جو آسمان پر ہے۔ تجھ پر ظاہر کی ہے اور مَیں بھی تجھ سے کہتا ہُوں کہ تُو پطرس ہے اور مَیں اِس پتھر پر اپنی کلیسیا بناؤں گا۔"

ان آیات میں خُداوند خود بھی اُس بات پر عمل کر رہا ہے جس کی تلقین دُوسروں کو کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ بُنیاد کھودتے جاؤ۔ جب تک کہ چٹان نہ نکل آئے اور اُس پر اپنی رُوحانی عمارتیں قائم کرو اور وہ چٹان خود خُداوند اور اُس کی تعلیم ہے اور جو شخص اُس کی تعلیم سُنتا ہے۔ لیکن اُس پر عمل نہیں کرتا۔ یا یُوں کہیں کہ برائے نام مسیحی کہلاتا ہے۔ لیکن درحقیقت دُنیا میں اُلجھا ہُوا ہے۔ وہ اپنا گھر ریت پر بناتا ہے۔

اور تمام رُوحانی عمارتوں کی پختگی کی جانچ یہ ہے کہ آیا وہ زندگی کے سخت اور تلخ تجربات کا مقابلہ کر سکتی ہیں یا نہیں۔

زمانۂ حاضر کے لئے جو عجلت پسند واقع ہوا ہے اور تہ تک کھودنے اور خاموشی کے ساتھ تیاری کرنے سے احتراز کرتا ہے - یہ ایک زبردست نصیحت ہے۔

ہماری شخصی زندگیوں کی رُوحانی حالت کے لئے یا دیگر رُوحانی معاملات کے لئے جن سے ہمیں دلبستگی ہے - یہ ایک نہایت ہی اہم سوال ہے۔ کیا ہم نے اِتنا گہرا کھودا ہے کہ ہم چٹان تک پہنچ گئے ہیں۔ یا ہم نے فوری نتائج کو ٹھوس بنیادوں پر ترجیح دی ہے؟ کیا ہم نے مسیح کی تعلیم کو ناقابلِ عمل خیال کرکے اُسے ترک کر دیا ہے اور کسی اور بُنیاد پر اپنے ایمان کی عمارت کو قائم کیا ہے؟ اگر ایسا کیا ہے تو وہ عمارت جلد گر جائے گی۔ وہ مینہ اور آندھی کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

مسیح کی کلیسیا کی تواریخ جو اُس کے کلام اور شخصیت پر مبنی ہے۔ اِس اصُول کی حقیقت کو بخوبی ثابت کرتی ہے اور آج تک باوجود مختلف آفات و انقلابات کے قائم ہے۔ دُنیا میں بہت سی انجمنیں مسیح کے نام میں برپا ہوئی ہیں۔ جو عارضی طور پر کلیسیا سے زیادہ کامیاب نظر آئی ہیں۔ اور اکثر اُن کی اِبتدا اور ترقّی کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ کلیسیا میں کوئی نقص یا کمزوری پیدا ہو گئی۔ لیکن یہ انجمنیں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ کسی نہ کسی آفت نے جو اِنسانی تمدّنی عمارتوں کو ہلا دیا کرتی ہیں۔ اُنہیں بھی گرا دیا۔ لیکن اب تک صرف ایک انجمن یا جماعت ایسی دیکھنے میں آئی ہے۔ جس نے ہر

قسم کی مشکلوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کیا ہے اور قائم ہے اور یہ وہ کلیسیا ہے جس کی بنیاد مسیح کے کلام پر رکھی گئی ہے۔ جس کا سلسلہ اُس کے رسُولوں سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں اُس کی مقرر کردہ ساکرامنٹس اُس کے احکام کے مطابق عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اور جو رسُولی ایمان اور پاک نوشتوں پر مبنی ہے۔

یہی وُہ کسوٹی یا معیار ہے جو کسی چیز کی دیرپائیگی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اِسی سے ہم اپنی زندگیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آزمائش ایک ایسی چیز ہے جو پورے طور پر ہماری زندگیوں کا اِمتحان کرتی ہے اور ہمارے اخلاقی اور مذہبی اصُولوں کو پرکھتی ہے۔ اِس امتحان میں کامیاب ہونا اور اس اخلاقی جنگ میں فتحیاب ہونا سب سے زیادہ اہم اور ضروری بات ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے۔ جب ہم اپنی مرضی۔ اپنی عقل اور اپنی محبت کو کُلیہ طور پر مسیح کے سپرد کر دیتے ہیں اور اُس کے پاک کلام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

"جب یسُوع نے یہ باتیں ختم کیں تو ایسا ہُوا کہ بھیڑ اُس کی تعلیم سے حیران ہوئی۔ کیونکہ وہ اُنکے فقیہوں کی طرح نہیں۔ بلکہ صاحبِ اختیار کی طرح اُنہیں تعلیم دیتا تھا"

یہاں پہاڑی وعظ ختم ہوتا ہے۔ لیکن جیسا بعض نے خیال کیا ہے۔ یہ تمام مسیحیت نہیں ہے اور جو ایسا خیال

کرتے ہیں۔ وہ مسیحی الٰہیات کو بالکل محدود کر دیتے ہیں۔ پہاڑی وعظ میں صرف دو تعلیمات کا ذکر ہے۔ یعنی مسیح کی الوہیت اور بنی نوع انسان کی گناہگاری۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ انہی دو تعلیموں پر تمام مسیحیت مشتمل ہے۔ غلط ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تعلیمات انسان کے اندر گناہ کا ایک زبردست احساس پیدا کرتی ہیں اور یوں خداوند یسوع مسیح کے کفارہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں (جس کا کوئی صریح بیان اس جگہ پایا نہیں جاتا) جو تمام دنیا کے گناہ کا فدیہ ہے) اور جس کے ذریعہ ہم آسمانی باپ سے وصال حاصل کرتے ہیں۔ لیکن وہ کفارہ جو صرف ہمارے گذشتہ گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے۔ وہ اصل علاج نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ہمیں ہماری کمزور حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ اصل کفارہ وہ ہے۔ جو ہمیں گناہ کی طاقت اور نجاست سے رہائی دلاتا ہے۔ لہذا پہاڑی وعظ اُس اخلاقی قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو پاک رُوح کے آنے اور خدا کے بندوں کے دلوں میں مسکن گزیں ہونے سے حاصل ہوتی ہے اور مسیحی مذہب کی تعلیم کا لُب لباب یہی ہے۔ باقی تمام باتیں پاک رُوح کی آمد اور مسیحانہ طبیعت کے حصول کی تیاریاں ہیں۔ مسیحی مذہب محض اُس منزلِ مقصود کے ذکر پر ہی اکتفا نہیں کرتا جہاں انسان کو پہنچنا ہے۔ بلکہ وہاں تک پہنچنے کی طاقت اور اہلیت بھی عنایت کرتا ہے۔

میری اور آپ کی مسیحیت کی کسوٹی یہی ہے کہ آیا ہم اُس اخلاقی منزلِ مقصود کی طرف ترقی کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارے عقیدے۔ ہماری ساکرامنٹس تمام اسی ایک معیار سے جانچے جاتے ہیں کہ کیا وُہ ہم میں مسیحی سیرت پیدا کر رہے ہیں؟ گو یہ سیرت مَوت کے بعد کمال کو پہنچتی ہے۔ تاہم ضرور ہے کہ اسی زندگی میں اُس کی مُستحکم بُنیاد رکھی جائے اور وہ پُورے طور پر ہمارے خیالات و جذبات پر حاوی ہو۔ لہٰذا چاہیئے کہ ہم ہر وقت اپنے آپ سے یہ سوال کرتے رہیں کہ کیا مَیں مسیح کی مانند ہوتا جا رہا ہُوں؟ آخری دن بہت سے اُس کے پاس آئیں گے اور اپنے صحیح عقیدہ۔ عبادت و کامیاب مسیحی خدمت کی بِناء پہ اُس سے صِلہ طلب کریں گے۔ لیکن وُہ اُن سے کہے گا کہ "میری تُم سے کبھی واقفیت نہ تھی"۔ وہ کسی ایسے شخص سے "واقفیت" نہ رکھے گا۔ جس میں اُسے اپنی شبیہ نظر نہ آئے۔

---

PDF by: Matthew Sinclear
→ Theological Research
Centre, Vehari.

---

Scanned with CamScanner

# تتمہ

Scanned with CamScanner

# تتمہ نمبر اوّل

## پہاڑی وعظ

وہ اُس بھیڑ کو دیکھ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور جب بیٹھ گیا تو اُس کے شاگرد اُس کے پاس آئے اور وہ اپنی زبان کھول کر اُنہیں یُوں تعلیم دینے لگا۔

مُبارک ہیں وہ جو دِل کے غریب ہیں۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہی اُن ہی کی ہے۔

مُبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں۔ کیونکہ وُہ تسلّی پائیں گے۔

مُبارک ہیں وہ حلیم ہیں۔ کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھُوکے اور پیاسے ہیں۔ کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو رحم دِل ہیں کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔

مُبارک ہیں وہ جو پاک دِل ہیں کیونکہ وہ خُدا کو دیکھیں گے۔

مُبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب سے ستائے گئے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی اُن ہی کی ہے۔ جب میرے سبب سے لوگ تم کو لعن طعن کریں گے اور ستائیں گے اور ہر طرح کی بُری باتیں تمہاری نسبت ناحق کہیں گے تو تم مُبارک ہو گے۔ خوشی کرنا اور نہایت شادمان ہونا۔ کیونکہ آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ اس لیئے کہ لوگوں نے اُن نبیوں کو بھی جو تُم سے پہلے تھے اسی طرح ستایا تھا۔

# مُتعلّقہ آیات از انجیل لُوقا

## لُوقا ۶: ۲۰-۲۶

پھر اُس نے اپنے شاگردوں کی طرف نظر کر کے کہا مُبارک ہو تم جو غریب ہو۔ کیونکہ خُدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔ مُبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو۔ کیونکہ آسودہ ہو گے۔ مُبارک ہو تم جو اب روتے ہو۔ کیونکہ ہنسو گے۔ جب ابنِ آدم کے سبب سے لوگ تم سے عداوت رکھیں گے اور تمہیں خارج کر دیں گے۔ اور لعن طعن کریں گے اور تمہارا نام بُرا جان کر کاٹ دیں گے۔ تو تم مُبارک ہو گے۔ اُس دن خوش ہونا اور خوشی کے مارے اُچھلنا۔ اِس لئے کہ دیکھو آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ کیونکہ اُن کے باپ دادا نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مگر افسوس تُم پر جو دولتمند ہو۔ کیونکہ تم اپنی تسلّی پا چکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو۔ کیونکہ بھوکے ہو گے۔ افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو۔ کیونکہ ماتم کرو گے اور روؤ گے۔ افسوس تم پر جب سب لوگ تمہیں بُرا بھلا کہیں۔ کیونکہ اُن کے باپ دادا جھوٹے نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائیگا؟ پھر وہ کسی کام کا نہیں۔ سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔

تم دُنیا کے نُور ہو جو شہر پہاڑ پر بسا ہے وہ چھپ نہیں سکتا اور چراغ جلا کر پیمانے کے نیچے نہیں۔ بلکہ چراغ دان پر رکھتے ہیں تو اُس سے گھر کے سب لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ اسی طرح تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے تمجید کریں۔

یہ نہ سمجھو کہ مَیں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسُوخ کرنے آیا ہُوں منسُوخ کرنے نہیں بلکہ پُورا کرنے آیا ہُوں۔ کیونکہ مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ جب تک سب کچھ پُورا نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑیگا اور یہی آدمیوں کو سکھائیگا وہ آسمان کی بادشاہی میں سب سے چھوٹا کہلائیگا۔ لیکن جو اُن پر عمل کریگا اور اُن کی تعلیم دیگا وُہ آسمان کی بادشاہی میں بڑا کہلائے گا۔ کیونکہ مَیں تم سے کہتا ہُوں اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوگے۔

تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا کہ خُون نہ کرنا اور جو کوئی خون کریگا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا۔ لیکن میں تُم سے یہ کہتا ہُوں کہ جو کوئی

لُوقا ۱۴: ۳۴ و ۳۵

نمک اچھا تو ہے۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے مزیدار کیا جائیگا؟ نہ وہ زمین کے کام کا رہا نہ کھاد کے۔ لوگ اُسے باہر پھینک دیتے ہیں۔ جس کے کان سُننے کے ہوں وہ سُن لے۔

لُوقا ۱۱: ۳۳

کوئی شخص چراغ جلا کر تہ خانہ میں یا پیمانہ کے نیچے نہیں رکھتا۔ بلکہ چراغدان پر رکھتا ہے تاکہ اندر آنے والوں کو روشنی دکھائی دے۔

لُوقا ۱۶: ۱۷

لیکن آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے مِٹ جانے سے آسان ہے۔

لُوقا ۱۲: ۵۸ و ۵۹

جب تک تُو اپنے مدعی کے ساتھ حاکم کے پاس جا رہا ہے تو راہ میں

اپنے بھائی پر غصّے ہوگا۔ وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدرِ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو اُس کو احمق کہیگا وہ آتشِ جہنم کا سزاوار ہوگا۔ پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گذرانتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ شکایت ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے اور جاکر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر۔ تب آکر اپنی نذر گذران۔ جب تک تُو اپنے مُدعی کے ساتھ راہ میں ہے اُس سے جلد صلح کر لے کہیں ایسا نہ ہو کہ مُدعی تجھے مُنصف کے حوالہ کردے اور مُنصف تجھے سپاہی کے حوالہ کردے اور تُو قید خانہ میں ڈالا جائے۔ مَیں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک تُو کوڑی کوڑی ادا نہ کردیگا۔ وہاں سے ہرگز نہ چھوٹیگا۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زِنا نہ کرنا۔ لیکن مَیں تُم سے یہ کہتا ہُوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی۔ وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زِنا کر چکا۔ پس اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے۔ کیونکہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنّم میں نہ ڈالا جائے اور اگر تیرا دہنا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُس کو کاٹ کر اپنے پاس سے پھینک دے۔ کیونکہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنّم میں نہ جائے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے اُسے طلاق نامہ لکھ دے۔ لیکن مَیں تُم سے یہ کہتا ہُوں

کوشش کر کہ اُس سے چھوٹ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وُہ تجھ کو مُنصف کے پاس کھینچ لے جائے اور مُنصف تجھ کو سپاہی کے حوالہ کرے اور سپاہی تجھے قید میں ڈالے۔ مَیں تجھ سے کہتا ہُوں کہ جب تک تُو دمڑی دمڑی ادا نہ کر دے گا۔ وہاں سے ہرگز نہ چھُوٹے گا۔

مرقس ۹: ۴۳-۴۸

اور اگر تیرا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے کاٹ ڈال۔ ٹُنڈا ہو کر زندگی میں داخل ہونا تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دو ہاتھ ہوتے جہنّم کے بیچ اُس آگ میں جائے جو کبھی بجھنے کی نہیں۔ اور اگر تیرا پاؤں تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے کاٹ ڈال۔ لنگڑا ہو کر زندگی میں داخل ہونا تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دو پاؤں ہوتے۔ جہنّم میں ڈالا جائے... اور اگر تیری آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال ڈال۔ کانا ہو کر خُدا کی بادشاہی میں داخل ہونا تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دو آنکھیں ہوتے جہنّم میں ڈالا جائے۔ جہاں اُن کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی۔

کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے۔ وہ اُس سے زِنا کراتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔

پھر تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لئے پوری کرنا لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ بالکل قسم نہ کھانا۔ نہ تو آسمان کی۔ کیونکہ وہ خُدا کا تخت ہے۔ نہ زمین کی۔ کیونکہ وہ اُس کے پاؤں کی چوکی ہے۔ نہ یروشلیم کی۔ کیونکہ وہ بزرگ بادشاہ کا شہر ہے۔ نہ اپنے سر کی قسم کھانا۔ کیونکہ تُو ایک بال کو بھی سفید یا کالا نہیں کر سکتا۔ بلکہ تُمہارا کلام ہاں ہاں یا نہیں نہیں ہو۔ کیونکہ جو اس سے زیادہ ہے وہ بدی سے ہے۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دُوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے۔ اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو کوئی تجھ سے قرض چاہے اُس سے مُنہ نہ موڑ۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا کرو تاکہ تُم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سُورج کو بدوں اور نیکوں

لُوقا ۱۶ : ۱۸

جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ کر دُوسری سے بیاہ کرے۔ وُہ زِنا کرتا ہے۔ اور جو شخص شوہر کی چھوڑی ہُوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زِنا کرتا ہے۔

لُوقا ۶ : ۲۷-۳۶

لیکن مَیں تُم سُننے والوں سے کہتا ہُوں کہ اپنے دشمنوں سے محبّت رکھو۔ جو تم سے عداوت رکھیں اُن کا بھلا کرو۔ جو تم پر لعنت کریں اُن کے لئے برکت چاہو۔ جو تمہاری تحقیر کریں اُن کے لئے دُعا کرو۔ جو تیرے ایک گال

دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینھہ برساتا ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ پس چاہیئے کہ تم کامل ہو۔ جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔

خبردار اپنے راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو۔ نہیں تو تمہارے باپ کے پاس جو آسمان پر ہے۔ تمہارے لئے کچھ اجر نہیں ہے۔

پس جب تو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا۔ جیسا ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ اُنکی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وُہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو خیرات کرے تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے۔ اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے۔ تاکہ تیری خیرات پوشیدہ رہے۔ اِس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے۔ تجھے بدلا دے گا۔

اور جب تم دُعا کرو تو ریاکاروں کی مانند نہ بنو۔ کیونکہ وہ عبادت خانوں میں اور بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دُعا کرنا پسند کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُن کو دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو دُعا کرے تو اپنی کوٹھڑی میں جا اور دروازہ بند کر کے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دُعا کر۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے۔ تجھے بدلا دے گا اور دُعا کرتے وقت غیر قوموں کے لوگوں کی طرح بک بک نہ کرو۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بہت بولنے کے سبب سے ہماری سُنی جائیگی۔ پس اُن کی مانند

پر طمانچہ مارے۔ دُوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے اور جو تیرا چوغہ لے اُس کو کُرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو تیرا مال لے لے اُس سے طلب نہ کر۔ اور جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں۔ تم بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گنہگار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اگر تم اُنہیں کا بھلا کرو جو تُمہارا بھلا کریں تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گنہگار بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور اگر تم اُنہیں کو قرض دو جن سے وصول ہونے کی اُمید رکھتے ہو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ گنہگار بھی گنہگاروں کو قرض دیتے ہیں تاکہ پُورا وصُول کر لیں۔ مگر تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر ناامید ہوئے قرض دو۔ تو تمہارا اجر بڑا ہوگا۔ اور تم خُدا تعالےٰ کے بیٹے ٹھہرو گے۔ کیونکہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے۔ جیسا تُمہارا باپ رحیم ہے تم بھی رحمدل ہو۔

لُوقا ۱۱: ۱-۴

پھر ایسا ہُوا کہ وہ کسی جگہ دُعا کر رہا تھا۔ جب کر چکا تو اُس کے شاگردوں میں سے ایک نے اُس سے کہا۔ اَے خُداوند! جیسا یُوحنا نے اپنے شاگردوں کو دُعا کرنا سِکھایا تُو بھی ہمیں سِکھا۔ اُس نے اُن سے کہا جب تُم دُعا کرو تو کہو اَے باپ! تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دیا کر۔ اور ہمارے گناہ معاف کر۔ کیونکہ ہم بھی اپنے ہر قرضدار کو معاف کرتے ہیں۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔

نہ بنو۔ کیونکہ تمہارا باپ تمہارے مانگنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ تم کن کن چیزوں کے محتاج ہو۔ پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ "اے ہمارے باپ تُو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے۔ زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تُو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔ بلکہ بُرائی سے بچا۔" اس لئے کہ اگر تم آدمیوں کے قصُور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تُم کو معاف کرے گا۔ اور اگر تم آدمیوں کے قصُور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصُور معاف نہ کرے گا۔

اور اگر تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صُورت اُداس نہ بناؤ۔ کیونکہ وہ اپنا مُنہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ اُنہیں روزہ دار جانیں۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تُو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور مُنہ دھو۔ تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے۔ تجھے بدلا دے گا۔

اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ۔ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔ بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا اور

لُوقا ۱۱ : ۳۴ - ۳۶

تیرے بدن کا چراغ تیری آنکھ ہے۔ جب تیری آنکھ درست ہے تو تیرا سارا بدن بھی روشن ہے اور جب خراب ہے تو تیرا بدن بھی تاریک ہے۔ پس دیکھ جو روشنی تجھ میں ہے تاریکی تو نہیں۔ پس اگر تیرا سارا بدن روشن ہو اور کوئی حصہ تاریک نہ رہے تو وہ تمام ایسا روشن ہوگا۔ جیسا اُس وقت ہوتا ہے۔ جب چراغ اپنی چمک سے تجھے روشن کرتا ہے۔

اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی۔ کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھیگا اور دوسرے سے محبت۔ یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے؟ یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ تو بھی تمہارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عُمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے اُن میں سے کسی کی مانند ملبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنوُر میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اَے کم اعتقادو تم کو کیوں نہ پہنائیگا؟ اس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں اور تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اُس کی بادشاہی اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو۔ تو یہ

لُوقا ۱۶ : ۱۳

کوئی نوکر دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دُوسرے سے محبّت۔ یا ایک سے ملا رہے گا۔ اور دُوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خُدا اور دولت دونو کی خدمت نہیں کر سکتے۔

لُوقا ۱۲ : ۲۲-۳۴

پھر اُس نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ اس لئے مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیونکہ جان خوراک سے بڑھ کر ہے اور بدن پوشاک سے۔ کوّوں پر غور کرو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ اُن کے مخزن ہوتا ہے نہ کوٹھی۔ تو بھی خُدا اُنہیں کھلاتا ہے۔ تمہاری قدر تو پرندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بڑھا سکے؟ پس جب سب سے چھوٹی بات بھی نہیں کر سکتے تو باقی چیزوں کی فکر کیوں کرتے ہو؟ سوسن کے درختوں پر غور کرو کہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے اُن میں سے کسی کی مانند ملبّس نہ تھا۔ پس جب خُدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی۔ ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اَے کم اعتقادو۔ تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ اور تم اس کی تلاش میں نہ رہو کہ کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے۔ اور نہ شکّی بنو۔ کیونکہ ان

سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لئے فکر نہ کرو۔ کیونکہ کل کا دن اپنے لئے آپ فکر کرلے گا۔ آج کے لئے آج ہی کا دُکھ کافی ہے۔

عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔ کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو۔ اُسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائیگی اور جس پیمانہ سے تُم ناپتے ہو۔ اُسی سے تمہارے واسطے ناپا جائے گا۔ تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا؟ اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تُو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا تیری آنکھ میں سے تنکا نکال دوں؟ اے ریاکار پہلے اپنی آنکھ میں سے تو شہتیر نکال۔ پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح دیکھ کر نکال سکے گا۔

پاک چیز کُتوں کو نہ دو۔ اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اُن کو پاؤں تلے روندیں اور پلٹ کر تُم کو پھاڑیں۔

سب چیزوں کی تلاش میں دُنیا کی قومیں رہتی ہیں لیکن تمہارا باپ جانتا ہے کہ تم اِن چیزوں کے محتاج ہو۔ ہاں اُس کی بادشاہی کی تلاش میں رہو تو یہ چیزیں بھی تمہیں مِل جائینگی۔ اَے چھوٹے گلے نہ ڈر۔ کیونکہ تمہارے باپ کو پسند آیا کہ تمہیں بادشاہی دے۔ اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو اور اپنے لئے ایسے بٹوے بناؤ جو پُرانے نہیں ہوتے۔ یعنی آسمان پر ایسا خزانہ جو خالی نہیں ہوتا۔ جہاں چور نزدیک نہیں جاتا اور کیڑا خراب نہیں کرتا۔ کیونکہ جہاں تمہارا خزانہ ہے وہیں تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔

لُوقا ۱۲: ۳۱-۳۴

عیب جوئی نہ کرو۔ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائیگی۔ مُجرم نہ ٹھہراؤ۔ تم بھی مجرم نہ ٹھہرائے جاؤ گے۔ خلاصی دو تم بھی خلاصی پاؤ گے۔ دیا کرو۔ تمہیں بھی دیا جائے گا۔ اچھا پیمانہ داب داب کر اور ہلا ہلا کر اور لبریز کر کے تمہارے پلّے میں ڈالیں گے۔ کیونکہ جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو۔ اُسی سے تمہارے لئے ناپا جائے گا۔

اور اُس نے اُن سے ایک تمثیل بھی کہی کہ کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دونوں گڑھے میں نہ گرینگے؟ شاگرد اپنے اُستاد سے بڑا نہیں۔ بلکہ ہر ایک جب کامل ہُوا تو اپنے اُستاد جیسا ہوگا۔ تُو کیوں اپنے بھائی کے آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا؟ اور جب تُو اپنی آنکھ کے شہتیر کو نہیں دیکھتا تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ بھائی لا اس تنکے کو جو تیری آنکھ میں ہے نکال دوں۔ اَے ریاکار۔ پہلے اپنی آنکھ میں سے تو شہتیر نکال۔ پھر اُس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے اچھی طرح دیکھ کر نکال سکے گا۔

مانگو تو تم کو دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائیگا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اُسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈھتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جائیگا۔ تم میں ایسا کونسا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وہ اُسے پتھر دے؟ یا اگر مچھلی مانگے تو اُسے سانپ دے؟ پس جبکہ تم بُرے ہو کر اپنے بچّوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا؟ پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی اُن کے ساتھ کرو۔ کیونکہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے۔

تنگ دروازہ سے داخل ہو۔ کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے اور اُس سے داخل ہونے والے بہت ہیں۔ کیونکہ وہ دروازہ تنگ ہے اور وہ راستہ سُکڑا ہے جو زندگی کو پہنچاتا ہے اور اُس کے پانے والے تھوڑے ہیں۔

جھوٹے نبیوں سے خبردار ہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں۔ مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیئے ہیں۔ اُنکے پھلوں سے تم اُن کو پہچان لوگے۔ کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا۔ نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے۔ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ پس اُن کے پھلوں سے تم اُن کو پہچان لوگے۔ جو مجھ سے اے خداوند اے خداوند کہتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں داخل

لُوقا ۱۱: ۹-۱۳

پس مَیں تُم سے کہتا ہُوں۔ مانگو تو تُمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائیگا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اُسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں سے ایسا کونسا باپ ہے کہ جب اُس کا بیٹا روٹی مانگے تو اُسے پتھر دے؟ یا مچھلی مانگے تو مچھلی کے بدلے اُسے سانپ دے؟ یا انڈا مانگے تو اُس کو بچھو دے؟ پس جب تم بُرے ہو کر اپنے بچّوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو آسمانی باپ اپنے مانگنے والوں کو رُوح القُدس کیوں نہ دے گا؟

لُوقا ۱۳: ۲۴-۲۷

اُس نے اُن سے کہا۔ جان فشانی کرو کہ تنگ دروازہ سے داخل ہو۔ کیونکہ مَیں تم سے کہتا ہُوں کہ بہتیرے داخل ہونے کی کوشش کریں گے اور نہ ہو سکیں گے۔ جب گھر کا مالک اُٹھ کر دروازہ بند کر چکا ہو اور تم باہر کھڑے دروازہ کھٹکھٹا کر یہ کہنا شروع کرو کہ اَے خُداوند ہمارے لئے کھول دے اور وہ جواب دے کہ مَیں تم کو نہیں جانتا کہ کہاں کے ہو۔ اُس وقت تم کہنا شروع کرو گے کہ ہم نے تو تیرے رُوبرُو کھایا پیا اور تُو نے ہمارے بازاروں میں تعلیم دی۔ مگر وہ کہے گا۔ میں تم سے کہتا ہُوں کہ مَیں نہیں جانتا کہ تم کہاں کے ہو۔ اَے بدکارو۔ تم سب مُجھ سے دُور ہو۔

لُوقا ۶: ۴۳-۴۹

کیونکہ کوئی اچھا درخت نہیں جو بُرا پھل لائے اور نہ کوئی بُرا درخت ہے جو اچھا پھل لائے۔ ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا

نہ ہوگا۔ مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ اُس دن بہتیرے مجھ سے کہینگے۔ اَے خداوند۔ اَے خداوند۔ کیا ہم نے تیرے نام سے نبوّت نہیں کی اور تیرے نام سے بدرُوحوں کو نہیں نکالا۔ اور تیرے نام سے بہت سے معجزے نہیں دکھائے؟ اُس وقت مَیں اُن سے صاف کہہ دونگا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ۔ پس جو کوئی میری یہ باتیں سُنتا اور اُن پر عمل کرتا ہے وہ اُس عقلمند آدمی کی مانند ٹھہریگا۔ جس نے چٹان پر اپنا گھر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا اور آندھیاں چلیں اور اُس گھر پر ٹکریں لگیں۔ لیکن وہ نہ گرا۔ کیونکہ اس کی بنیاد چٹان پر ڈالی گئی تھی اور جو کوئی میری یہ باتیں سُنتا ہے اور اُن پر عمل نہیں کرتا۔ وہ اُس بیوقوف آدمی کی مانند ٹھہرے گا جس نے اپنا گھر ریت پر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا اور آندھیاں چلیں اور اُس گھر کو صدمہ پہنچایا اور وہ گر گیا اور بالکل برباد ہو گیا۔

جب یسُوع نے یہ باتیں ختم کیں تو ایسا ہُوا کہ بھیڑ اُس کی تعلیم سے حیران ہُوئی۔ کیونکہ وہ اُن کے فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار کی طرح اُن کو تعلیم دیتا تھا۔

جب وہ اُس پہاڑ سے اُترا تو بہت سی بھیڑ اُس کے پیچھے ہولی۔

ہے۔ کیونکہ جھاڑیوں سے انجیر نہیں توڑتے اور نہ جھڑ بیری سے انگور۔ اچھا آدمی اپنے دل کے اچھے خزانہ سے اچھی چیزیں نکالتا ہے۔ اور برا آدمی برے خزانہ سے بری چیزیں نکالتا ہے۔ کیونکہ جو دل میں بھرا ہے۔ وہی اُس کے مُنہ پر آتا ہے۔

جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو کیوں مجھے خداوند خداوند کہتے ہو؟ جو کوئی میرے پاس آتا اور میری باتیں سُن کر اُن پر عمل کرتا ہے۔ میں تمہیں جتاتا ہوں کہ وہ کس کی مانند ہے۔ وہ اُس آدمی کی مانند ہے جس نے گھر بناتے وقت زمین گہری کھود کر چٹان پر بُنیاد ڈالی۔ جب طوفان آیا اور سیلاب اُس گھر سے ٹکرایا تو اُسے ہلا نہ سکا۔ کیونکہ وہ مضبوط بنا ہوا تھا۔ لیکن جو سُن کر عمل میں نہیں لاتا وہ اُس آدمی کی مانند ہے۔ جس نے زمین پر گھر کو بے بنیاد بنایا جب سیلاب اُس پر زور سے آیا تو وہ فی الفور گر پڑا اور وہ گھر بالکل برباد ہوا۔

PDF by: Matthew Sinclear
→ Theological Research
Centre, Vehari.

Scanned with CamScanner

# تتمہ نمبر دوم

## مسیحیوں کے لئے دس احکام

متی ۵ : ۲۱ - ۴۸ کی تفسیر کے ضمن میں ہم نے دیکھا تھا کہ ہمارا خداوند مختلف احکام کا بیان کرتے ہوئے مختلف اخلاقی اُصولوں کو پیش کرتا ہے۔ لہذا جب وہ چھٹے حکم کا ذکر کرتا ہے (آیات ۲۱-۲۴) تو اُسکے بنیادی اخلاقی اصُول کو زیادہ وسیع کر دیتا ہے اور زبان کے الفاظ اور دل کے خیالات کو بھی اُس میں شامل کرتا ہے۔ اسی طرح ساتویں حکم پر غور کرتے ہوئے نہ صرف ایک زیادہ سخت قانونِ نکاح کے ذریعہ زناکاری کے گناہ کے دائرے کو وسیع کر دیتا ہے (آیات ۳۱-۳۲) بلکہ گناہ کی نیت کو ارتکاب گناہ[۱] کے مترادف قرار دیتا ہے (آیات ۲۷ - ۲۸) اور جب انسان اس بات کو پہچان لیتا ہے تو اخلاقی انضباط پر زیادہ زور دیتا ہے (آیات ۲۹-۳۰) حکم نمبر ۳ پر غور کرتا ہُوا ہمارا خداوند بتلاتا ہے کہ نہ صرف خدا کے نام کی قسم کو توڑنا غلط ہے (آیت ۳۳) بلکہ قسم کھانا ہی نامناسب ہے (آیات ۳۴-۳۶) علاوہ ازیں وہ اس حکم

[۱] یہ اخلاقی اصول یہودیوں کے اخلاقی اصول کی نسبت جس کا ذکر کتاب بنام ڈیڈا کی (DIDACHE) میں آیا ہے مختلف تر ہے اور وہ اصول یہ ہے۔ غصہ مت ہو کیونکہ غصہ قتل کا موجب ہو سکتا ہے۔ شہوت سے بچو کیونکہ شہوت زناکاری کا باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے خداوند کے فرمان کے مطابق نیت کا بگڑ جانا ہی گناہ ہے۔ خواہ اس کے نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ یعنی افعال خداوند کی نظر میں اس قدر اہمیت نہیں رکھتے جس قدر کہ درست نیت اور ارادہ۔

کی سلبی صورت کو ایجابی صورت میں تبدیل کرتا ہوا اُس کے اطلاق کو بھی وسیع کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ قسم کھانے سے ہر حالت میں پرہیز کرنا چاہیئے۔ (آیت ۳۷) اور ہر بات میں اخلاص اور راست گفتاری سے کام لینا چاہیئے۔

اسی طرح انتقامِ غیر مسدُود اور محبّتِ محدود (آیات ۳۸-۴۸) کے بیان میں بھی خُداوند دو اصُولوں کو پیش کرتا ہے۔ یعنی بدی کے متعلق تنبیہہ کی جگہ نیکی کی تاکید کرتا ہے اور غیر مکمّل اور محدُود فرائض کی جگہ کامل اور لامحدُود فرائض پر زور دیتا ہے۔

ان اصُولوں کا اطلاق عام طور پر ہر ایک حکم پر ہو سکتا ہے۔

۱۔ میرے حضور تیرے لئے دُوسرا خُدا نہ ہو۔ گو شروع میں یہ حکم اپنے معنی یا اطلاق کے لحاظ سے محدود ہو تو ہو لیکن زبُور نویس اور انبیا کے صحیفوں میں جو آنے والے مسیح کے لئے لوگوں کو تیار کر رہے تھے یہ تعلیم تمام دنیا کے لئے عالمگیر اطلاق رکھتی ہے اور انسان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک واحد اور برحق خُدا کو اپنی تمام شخصیّت سے تسلیم کرے اور اپنی زندگی کے ہر لمحہ اور فعل میں اُس کی بزرگی کا اظہار کرے۔

"تُو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل (یا ارادہ) اور اپنی ساری جان (یعنی اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ) اور اپنی ساری عقل (یا سمجھ) اور اپنی ساری طاقت (یعنی ایک زبردست اور پُر مشقت خدمت کے ذریعہ) سے محبّت رکھ۔" اِس حکم میں ذیل کی باتیں شامل ہیں:-

(الف) خُدا کی فضیلت اور الوہّت کا اعتراف۔ اسے ہر بات میں مقدّم جگہ دینا اور اس بات کو تسلیم کرنا کہ ہماری زندگی اور اُس کی تمام طاقتیں خُدا کی امانت ہیں جنہیں ہمیں اُس کے جلال کے لئے استعمال کرنا ہے۔

(ب) حقیقی انکسار۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ ہم اس بات کو پہچانیں کہ ہماری زندگی اور خوشحالی کا انحصار خُدا پر ہے۔ اس حقیقت کی تردید اور اپنی لیاقتوں پر جو درحقیقت خُدا کی دی ہُوئی ہیں فخر کرنا نہ صرف شرارت ہے۔ بلکہ انتہا درجہ کی جہالت ہے[1]۔

(ج) خُدا کی ذات کے مکاشفہ کو جو باپ۔ بیٹا اور رُوح القدس میں ہوتا ہے بخوشی تمام تسلیم کرنا۔ اُس کے نام پر اعتقاد رکھنا اور اپنی زبان اپنی زندگی اور اپنی عبادت میں اُس کا علانیہ اقرار کرنا۔

۲۔ **تُو اپنے لئے کوئی مورت مت بنا**۔ خُداوند اس سلبی حُکم کو بھی ایک ایجابی ہدایت میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ خُدا کی عبادت درست طریق پر ہونی چاہیئے یعنی رُوح اور راستی سے۔ یا بالفاظ دیگر خُداوند کی دُعا اور پاک عشاء کی رُوح میں جنہیں خود خُداوند نے مقرّر کیا ہے۔ اس قسم کی عبادت میں قوّتِ ارادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی نہ کوئی معقول طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جسم کی تمام قوّتوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ خُدا کے کلام پر غور کرنے میں عقل کو اِستعمال کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ خُدا کے متعلق صحیح تصوّرات حاصل ہوں۔ دُوسروں کے لئے یعنی کلیسیا۔ بنی نوع انسان۔ مختلف جماعتوں اور افراد کے لئے دُعا کرنی پڑتی ہے۔ علاوہ اِس کے خود اپنے لئے ہر وقت دُعا کی ضرورت رہتی ہے۔ اس عبادت میں جماعتی اور خلوتی دُعائیں بھی شامل ہیں۔ حمد و ثنا و مُناجات بھی اس کا حصّہ

---

[1] خُدا اور انسان کے ساتھ انکسار سے پیش آنا اپنی اصل حقیقت کو پہچاننا ہے

ہیں۔ غرض کہ اس عبادت کے دو بڑے حصّے ہیں۔ یعنی پاک عشاء (لوقا ۲۲: ۱۹) اور خلوتی دُعا (متی ۶: ۶)

گو تجسّم کی وجہ سے بُت پرستی کا امکان بہت کم ہوگیا ہے تو بھی یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا کلیسیا نے خاطر خواہ مقابلہ نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اگر ہماری عبادت میں ذیل کی باتیں نظر آئیں تو وہ بُت پرستی شمار کی جائیں گی۔

(۱) خُدا کے علاوہ دیگر اشخاص کو درمیانی سمجھ کر اُنہیں اپنی عبادت کا مورد بنانا۔ اس لئے کہ اُن تک رسائی حاصل کرنا آسان معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اشیا پر اپنی توجّہ قائم کرنا اور یوں خُدا کی ہمہ جا حاضری کی برکتوں سے محرُوم رہنے کے خطرے میں پڑنا۔

(۳) خُدا کے متعلق غلط تصوّرات قائم کرنا اور اُن پر اپنی عبادت کا دارومدار رکھنا۔ مثلاً دُعا کی مقبولیّت کا انحصار کسی خاص جگہ یا عرصہ پر رکھنا جو یُوحنّا ۴: ۲۱ وغیرہ اور متی ۶: ۷ کی تعلیم کے بالکل برخلاف ہے۔

**۳۔ تُو خُداوند اپنے خُدا کا نام بے فائدہ مت لے۔** یہ سوگند شکنی کا سلبی حُکم راست گفتاری کی عام اور عالمگیر ہدایت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت میں اِس ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ خُدا کی حضوری میں رہنا چاہیئے۔ اور اُس کی حضوری میں رہتے ہوئے سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہنا چاہیئے۔ خواہ وہ وعدے ہوں یا عام باتیں ہوں اور عام باتوں میں وہ تمام اقوال شامل ہیں جو ہماری شخصیت۔ تواریخ یا سائینس سے تعلّق رکھتے ہیں۔ راست گفتاری کے فرض کا تعلق زندگی کے ہر صیغہ سے ہے۔ یعنی سیاسیات۔ تجارت۔ بحث

مُباحثہ۔ خاندان وغیرہ سے۔ اور کسی حالت میں بھی ہمارا اپنے نجی فائدہ اپنی کلیسیا یا اپنی جماعت کے لئے دوسروں کو دھوکا دینا جائز نہیں ہو سکتا۔[1]

[1] اس امر کا انکار کرنا بہت مشکل ہے کہ بعض غیر معمولی مواقع ایسے آجاتے ہیں کہ جہاں لفظی طور پہ جھوٹ بولنا فرض معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس وقت جھوٹ نہ بولا جائے تو کئی تمدنی خرابیوں کا اندیشہ ہوتا ہے۔ غالباً ہر ایک شخص اس حالت میں جھوٹ بولنے کو جائز قرار دے گا۔ جب کسی خونی کے ہاتھ سے کسی کی جان بچانا مقصود ہو۔ مَیں نے دو دفعہ ماسٹر آف بلی ال (MASTER OF BALLIOL.) کو اس سوال کے جواب میں کہ ایسے حالات کے درمیان کیا کرنا چاہیئے۔ یہ کہتے سُنا۔ "شائد مَیں جھوٹ بولوں۔ لیکن مَیں اس کے متعلق نہ تو پہلے سے کچھ سوچوں گا اور نہ بعد میں اُسے جائز ٹھہرانے کی کوشش کروں گا۔" ان غیر معمولی حالات کے متعلق یہ بہترین جواب ہے۔ لیکن بعض ایسے بھی موقعے ہوتے ہیں جہاں خاموشی اختیار کرنا فرض منصبی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ خاموشی جھوٹ کے برابر نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر۔ وکیل یا وزیر سے ایک ایسا سوال پُوچھا جاتا ہے جس میں کسی اہم راز کی پردہ دری ہوتی ہے۔ اس حالت میں اُسے یا تو کوئی ایسا جواب دینا پڑے گا جس سے سُننے والوں کو مغالطہ میں ڈالا جائے۔ یا اپنی خاموشی سے اس راز کو افشا کرنا پڑے گا۔ اسی طرح انگریزی کلیسیا کے اُن قوانین کے ذریعہ جو ۱۶۰۳ء میں مرتب ہوئے۔ خادمانِ دین سے قسم لی جاتی ہے کہ وُہ بعض کلیسیائی رازوں کو ہرگز کسی پر ظاہر نہ کریں۔ اب ان حالات میں اُنہیں مجبوراً اُن رازوں کا تحفظ کرنا پڑتا ہے۔ اندریں حالات اگر سیاح اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ منصبی یا کلیسیائی بھید جن کے متعلق حلف اُٹھانی پڑتی ہے۔ عام لوگوں کی واقفیت کے لئے نہیں ہیں تو بہت سی دقتوں کا ازالہ ہو جائے۔ یہ باتیں میں نے اس لئے تحریر کی ہیں کہ ایسے غیر معمولی حالات میں

اس حکم کے ذریعہ ہمارا خداوند اُن تمام باتوں کو بھی ناجائز قرار دیتا ہے۔ جو ہمہ جا حاضر و ناظر خدا کی واجب تعظیم کے منافی ہیں۔ مثلاً کفر آمیز اور بے معنی قسمیں۔ "یاوہ گوئی۔ بیہودہ گوئی اور ٹھٹھے بازی۔ کیونکہ یہ لائق نہیں"۔

۴۔ تو سبت کا دن پاک رکھنے کے لئے یاد کر۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنے سارے کام کاج کر۔ لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے۔ اُس میں کچھ کام نہ کر۔ نہ تو نہ تیرا بیٹا۔ نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرے مواشی اور نہ تیرا مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو۔ کیونکہ خداوند نے چھ دِن میں آسمان اور زمین۔ دریا اور سب کچھ جو اُن میں ہے بنایا۔ اور ساتویں دن آرام کیا۔ اس لئے خداوند نے سبت کے دِن کو برکت دی اور اُسے مُقدّس ٹھہرایا۔

اس حکم میں انسانی زندگی کے لئے تین قانون پائے جاتے ہیں۔

(الف) محنت کا قانون۔ اس میں شک نہیں کہ محنت مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ یعنی وہ جو جسم۔ عقل۔ سیرت۔ رُوح یا قربانی سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن محنت کی توقع ہر انسان سے کی جاتی ہے۔

---

جہاں راست گفتاری سے کام لینا ناممکن نظر آئے۔ وہاں اس امر کا اعلان کر دینا چاہیئے لیکن ساتھ ہی اس کے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے ان دلائل سے تسلّی نہیں جو جیسوایٹ (JESUITS) اینگلیکن (ANGLICAN) یا پراٹسٹنٹ صاحبان اس امر کی اخلاقی حمایت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً دیکھو کتاب "مسیحی اخلاقیات" از نیومن سمائیتھ (NEWMAN SMYTH) صفحہ ۳۸۸ وغیرہ۔

"جسے محنت کرنی منظور نہ ہو وہ کھانے بھی نہ پائے"

(ب) آرام کا قانون۔ جیسے خُدا نے بھی آرام کیا۔ خُدا محنت بھی کرتا ہے۔ مثلاً دُنیا کی تخلیق۔ نجات اور اپنی بادشاہت کے قائم کرنے میں اور پھر آرام کرتا ہے اور اپنی ہاتھ کی کاریگری پر غور کرتا ہے۔ دیکھو پیدائش ۱: ۳۱۔ متی ۳: ۱۷۔ مکاشفہ ۲۱: ۲۔ ہمارے خُداوند کے فرمان کے مطابق خُدا ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے۔ لیکن کام کے دوران میں آرام بھی کرتا ہے۔ لہذا چاہیئے کہ انسان خُدا کے آرام میں حصّہ دار ہو۔ لیکن یہ اُسی وقت مُمکن ہے۔ جب وہ خُدا میں آرام ملے (زبور ۱۲۷)

اور سبت کا آرام اُسی رُوحانی آرام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شروع میں سبت کا دِن جسمانی آرام کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ بعد میں عبادت کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ لیکن مسیحی سبت ابتدا میں محض عبادت کے لئے مخصوص تھا۔ مگر بعد میں جسمانی آرام کا تصوّر بھی اُس میں داخل ہو گیا۔ اتوار کا خاص مقصد یہ ہے۔ کہ لوگ اُس دن اپنی توجّہ عبادتِ الٰہی کی طرف لگائیں اور اُس کے لئے وقت نکالیں اور یُوں اُس آرام کو حاصل کریں۔ جو خُداوند میں ملتا ہے۔ مقصد ثانی یہ ہے کہ ہر خاص و عام کو جسمانی آرام اور تفریح کا موقع ملے۔ لہذا اتوار کے متعلّق تمام سوالات کا جواب اِنہی دو مقاصد کی روشنی میں دینا چاہیئے۔

ج۔ رفاقت کا قانون۔ رفاقت کے متعلّق عہدِ جدید میں ایک خاص اصُول پیش کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام بنی نوع انسان مساوی

حقوق رکھتے ہیں۔ نہ کوئی بڑا ہے۔ نہ چھوٹا ہے۔

۵۔ تُو اپنے ماں باپ کو عزّت دے تاکہ تیری عمر اُس زمین پر جو خُداوند تیرا خُدا تجھے دیتا ہے دراز ہو۔ اس کے ذریعہ جس کے ساتھ ایک وعدہ بھی کیا جاتا ہے۔ ماں باپ کی عزّت پر نہ صرف خاندانی زندگی بلکہ قومی ترقی کا انحصار بھی بتلایا جاتا ہے (دیکھو استثنا ۵ : ۱۶) اسی اصُول کی توضیح و توسیع امثال کی کتاب میں کی جاتی ہے۔ جہاں خاندانی زندگی کا ذکر آتا ہے۔ مگر اس کا کمال افسی ۵ : ۲۲+۶ : ۹ و کلسی ۳ : ۱۸+۴ : ۱ میں پایا جاتا ہے۔ جہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ والدین اور اولاد۔ شوہر اور بیوی۔ مالک اور نوکر کے فرائض ایک دوسرے کی طرف ہیں۔ اسی اصُول میں کلیسیا اور حکومت کے فرائض بھی شامل کیے جاتے ہیں (دیکھو عبرانی ۱۳ : ۱۷+ رومیوں ۱۳ + ۱ پطرس ۲ : ۱۳+۳ : ۷) اس اصُول کے مطابق ہم پر نہ صرف کلیسیا کی اطاعت بلکہ اس کی مالی امداد کرنا بھی فرض ہے۔ "اپنی ماں کو بھی تُو اتنا دے۔ جتنا تُو دیگر انجمنوں کو دیتا ہے۔"

۶۔ تُو خون مت کر۔ ہمارا خُداوند اس حکم کی اس درجہ تک توسیع کرتا ہے کہ خیال اور قول میں بھی کسی کے خلاف نفرت یا حقارت کا اظہار ممنُوع قرار دیا جاتا ہے اور جب اِس حکم کی سلبی صورت کو ایجابی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ تو ہم پر اَوروں کی جسمانی اور رُوحانی ترقی کی حتی المقدور کوشش

کرنا فرض ہو جاتا ہے اور ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنے پڑوسی کو اپنی مانند پیار کریں۔ بلکہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت رکھیں

۷۔ **تُو زِنا مت کر**۔ اِس حُکم کی توضیح ہمارا خُداوند یوں کرتا ہے۔ کہ اوّل تو نکاح کے قانون کو اور بھی زیادہ سخت اور مضبُوط کر دیتا ہے اور طلاق کے بعد نکاح ثانی کی بعض حالتوں کو زِنا کے دائرے میں شمار کرتا ہے۔ جو یہودی نظام میں جائز سمجھی جاتی تھیں اور پھر وُہ گناہ کے ارادے کو ارتکابِ گناہ کے برابر قرار دیتا ہے۔ بعض موقعوں پر خُداوند زِنا کاری۔ حرامکاری اور شہوت پرستی کو اُن گناہوں کی فہرست میں بڑی اُبھری ہوئی جگہ دیتا ہے جو دل سے یا اندر سے نکلتے ہیں تاکہ اس بات پر زور دیا جائے کہ انسان کے دل کی جو ہر قسم کے خیالوں اور ارادوں کا مصدر ہے صفائی ہونی چاہیئے۔ اگر اس حکم کو ایجابی صُورت میں دیکھا جائے اور اُس کے دائرے کو وسیع کر دیا جائے تو اس میں "آزادی کا قانون" پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ کھانے پینے اور جنسی جذبات میں ہمیں اپنے کو رُوح کے تابع کرنا چاہیئے اور کہ اپنی باطنی تہذیب و تادیب کے لئے روزہ رکھنا چاہیئے۔

۸۔ **تُو چوری مت کر**۔ اگر اس سلبی حُکم کو ایجابی صُورت میں پیش کیا جائے تو شائد یہ شکل اختیار کرے گا۔ تُو اچھا پیشہ اختیار کر کے ہاتھوں سے محنت اختیار کر تاکہ محتاج کو دینے کے لئے تیرے پاس کچھ ہو[1]۔ دُوسرے معنی میں یہ اپنے پڑوسی کو اپنی مانند پیار کرنا

---

[1] افسی ۴: ۲۸ + ۱ تمطاؤس ۶: ۱۷ و ۱۸ + یعقُوب ۵: ۴۔

ہے۔ اُس کی ملکیت کی اُسی طرح حفاظت کرنا ہے۔ جس طرح ہم اپنی ملکیت کی کرتے ہیں اور جس طرح ہم اپنی محنت کے عوض میں مناسب اُجرت طلب کرتے ہیں۔ اُسی طرح اپنے پڑوسی کے لئے بھی چاہیں۔ مسیحی نکتۂ خیال کے مُطابق اس حکم کی خلاف ورزی نہ صرف عام چوری کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بلکہ ذیل کی صُورتوں میں بھی ہوتی ہے۔

(۱) تجارت اور کاروبار میں بددیانتی کرنا۔ یعنی خریدنے والے کو اُس کے روپیہ کے عوض میں کم یا ناقص مال دینا یا کسی اور شخص کو اُس کے حق سے زیادہ روپیہ دینا۔ (۲) دُوسروں کو کم تنخواہ دے کر ضرورت سے زیادہ کام لینا۔ (۳) رشوت لینا یا رشوت دینا۔ یا کسی اَور صُورت میں مالک کو ملازم کی بہترین خدمت سے محروم رکھنا۔ (۴) دُوسروں سے کام کی توقع رکھنا اور خود محنت سے جی چُرانا۔ (۵) خیرات کے فرض سے پہلو تہی کرنا یا اُسے ناقص طور پر ادا کرنا۔ اس زمانہ میں ہمیں خاص طور پر اِس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کمپنیوں میں شامل ہونا شرکاء کو اُن کی انفرادی اخلاقی ذمہ واریوں سے بری نہیں کر دیتا۔ مثلاً ہر ایک شریک کا فرض ہے کہ وہ ایسے کارپردازوں (DIRECTORS) کے اِنتخاب کی کوشش کرے۔ جو راستی کے طالب ہوں۔ ہر قسم کی ناراستی کے خلاف جنگ کرے۔ اُن تمام منافعات سے پرہیز کرے جو بددیانتی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہر حالت میں مسیحی کے لئے نُقصان پہنچانے کی نسبت نُقصان اُٹھانا بہتر ہے۔

۹۔ تُو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔ اس حکم کو بھی اگر ایجابی صورت میں تبدیل کیا جائے تو اس کا اطلاق بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمیں نہ صرف ایسی تہمتوں سے احتراز کرنا چاہیئے جو ہم عمداً دوسروں پر لگاتے ہیں۔ بلکہ ہماری گفتار کا محرک ہمیشہ محبت ہونا چاہیئے اور ہمیں دوسروں کی نیک نامی کا اُسی درجہ تک تحفظ کرنا چاہیئے۔ جس درجہ تک ہم اپنی نیک نامی کے خواہشمند ہیں۔ بعض اوقات ہمیں مجبوراً دُوسروں کو دھمکانا۔ سزا دینا اور اُن پر الزام لگانا پڑتا ہے۔ لیکن اس حالت میں چاہیئے کہ ہم محبت اور خیر اندیشی سے کام لیں۔

۱۰۔ تُو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ وغیرہ جیسے اُوپر کہا گیا ہے۔ دس احکام شروع سے آخر تک خارجی زندگی کے ساتھ نہیں بلکہ دل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حکم بھی ہرگز یہ نہیں سکھاتا کہ ہم اپنے ذاتی مفاد کی زبردست جبلت کے برخلاف عمل کریں بلکہ یہ بتاتا ہے کہ ہمیں خُدا کے اُن ارادوں سے واقف ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ہمارے متعلق ہیں اور یہ آرزُو رکھنی چاہیئے کہ اور لوگ بھی ایسا کریں۔ لہٰذا اس حُکم کی رُو سے دُوسروں کی ترقی اور اقبال مندی کو دیکھ کر حاسد ہونا اور جو کچھ خُدا نے ہم کو دیا ہے اُس پر قناعت نہ کرنا معیوب ہے۔ اِس قسم کی ترقی اور بزرگی کی خواہش جس میں خُدا کی مرضی کو نظر انداز کیا جائے ممنوع ہے۔ نئے عہد نامہ کی تعلیم ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم اعلےٰ درجہ کی نسبت ادنےٰ کو اور اختیار کی بجائے اطاعت

کو زیادہ پسند کریں۔ لیکن باوجود اس کے عہد جدید کی یہ بھی تعلیم ہے کہ ہم دُنیا کی موجودہ بد ترتیبی کے جو اِس امر کا نتیجہ ہے۔ کہ بُری مرضیاں خُدا کی مرضی کا مقابلہ کرتی ہیں برخلاف جنگ کریں۔ اِس قسم کی عدم قناعت آسمان کی بادشاہت کی اشاعت میں انسان کو مسیح کا ہمخدمت بنا دیتی ہے۔

مَیں نے دَس احکام کا یہ تجزیہ اُن کے عمیق ترین اصُولوں کی بناء پر اس لئے کیا ہے کہ اوّل تو مَیں اِن تشریحات کو جو آج کل مروّج ہیں تسلّی بخش نہیں سمجھتا اور دوم اِس لئے کہ یہ یقین میرے دِل میں جڑ پکڑ جائے کہ دس احکام گو خُداوند کے فرمان کے مطابق کامل نہیں ہیں تو بھی وہ "خُدا کا کلام" ہیں۔ اور وہ اُس کی برگزیدہ قوم کی اخلاقی تربیت کے لئے قلمبند کئے گئے اور اُس قوم کے ذریعہ وُہ تمام بنی نوعِ انسان کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں وہ اصُول جو اِن احکام میں مخفی ہیں۔ نہایت ہی سبق آموز ہیں اور مجھے دُنیا کے ابتدائی اخلاقی قوانین میں کوئی ایسا سلسلہ نظر نہیں آتا جو اُن کا مقابلہ کر سکے۔

# تتمّہ سوم

## طلاق کے متعلّق کلیسیا کا فرض

کتاب کے متن میں طلاق کی نسبت ذیل کی باتیں تسلیم کی گئی ہیں۔

(۱) مسیح اپنے شاگردوں کے لئے اِس قسم کے طلاق کو ممنوع قرار دیتا ہے جو زنا کے علاوہ کسی اور وجہ کی بنا پر دیا جائے۔ اور نکاح ثانی کی اجازت دے۔ لیکن اگر زِنا کی وجہ سے طلاق دیا جائے تو خُداوند اس کو جائز تصوّر کرتا ہے۔

(۲) لیکن انگلستان کا قانونِ کلیسیا اور عام دستور باقی تمام مغربی کلیسیا کی طرح نکاح کو ایک ایسا رشتہ تسلیم کرتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ فی زمانہ ان دونوں باتوں کا انکار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ اِن کے متعلّق کچھ اور کہا جائے۔

۱۔ وہ لوگ جو اِس امر کا انکار کرتے ہیں کہ خُداوند کے الفاظ میں جو دو بار متّی کی انجیل میں مرقوم ہوئے ہیں۔ طلاق بوجہ زِنا کے بعد بے گناہ فریق کو نکاح ثانی کی اجازت دی جاتی ہے ذیل کی دو پرانی دلائل کو ترک کرتے جاتے ہیں۔

(الف) کہ حفظ "زِنا" (ROPVETA) صرف اُس گناہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو نکاح کے قبل کیا جائے۔

(ب) کہ وہ الفاظ جو متّی ۱۹ میں مقتبس کئے جاتے ہیں صرف

یہودیوں کے لئے ہیں۔ اور کہ اِس باب کے اُس حصّہ کے متعلّق شک ہے جہاں الفاظ اور "دوسری سے بیاہ کرے" استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن اِس کا جواب یُوں دیا جا سکتا ہے (۱) کہ عام طور پر وہ لوگ بھی جو کلام کے متن کی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور جن میں ڈاکٹر ہورٹ صاحب اکثر اصحاب سے آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ویٹیکن (VATICAN) نُسخہ کے متن کی صحت پر بہت زور نہیں دیتے۔ اور صرف یہی ایک نُسخہ ہے۔ جس میں الفاظ زیر بحث پائے نہیں جاتے۔ (۲) کہ مقام زیر غور کی تبدیلی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اُسے باب ۵ کے مطابق بنایا جائے۔ (۳) یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ لوگوں کا اعتقاد ایک مسلّمہ متن سے ہٹا دیا جائے (۴) مطلب ہر حالت میں صاف ہے۔ یعنی اگر ابواب ۵ و ۱۱ میں سے الفاظ "اور دُوسری سے بیاہ کرے" نکال بھی دیئے جائیں۔ تو بھی اُن میں نکاح ثانی کے متعلّق آزادی دی جاتی ہے۔ یہودیوں کے نزدیک طلاق کے یہی معنی تھے۔ یعنی یہ کہ اُنہیں نکاح ثانی کی اجازت تھی۔ کیا کوئی صاحبِ عقل یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو سکتا ہے کہ طلاق جس کے معنے یہ ہوں کہ زِنا کار بیوی کو گھر سے بالکل علیٰحدہ کر دیا جائے اور نکاح ثانی کی اجازت نہ ہو۔ صِرف ایک مسیحی کے لئے ممکن ہے۔

لہٰذا مَیں سمجھتا ہُوں کہ متّی کے دونوں مقامات کی تعلیم بالکل صاف ہے اور اُس کی تردید کرنا ناممکن ہے۔

(۲) برعکس اس کے انگریزی کلیسیا نے طلاق کے مغربی قانون

کو جو مشرقی قانون سے بالکل مختلف ہے ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور اب تک اس قانون کی کبھی تردید نہیں کی گئی۔ بلکہ اصلاح کے بعد کے تمام قوانین کا ایک مستقل حصّہ مانا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چونکہ انگلستان میں سلطنت اور کلیسیا کے مابین شروع سے ایک نہایت ہی قریبی تعلق قائم رہا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کون سے خالص کلیسیائی قوانین ہیں مشکل ہے۔ گذرے ایّام میں طلاق کے مسئلہ کے متعلق ذیل کی تبدیلیاں وقوع میں آئی ہیں۔

(الف) انگلستان کے بعض بہترین خادمانِ دین اور مفسرین نے طلاق بوجہ زِنا کے بعد فریق معصوم کے نکاح ثانی کی تائید کی ہے۔

(ب) ۱۸۸۸ء کی لیمبتھ کانفرنس نے بھی اس قسم کے نکاح ثانی کی اجازت دی ہے۔

(ج) کچھ عرصہ ہوا کہ انگلستان کے ملکی قوانین نے معصوم اور مجرم ہر دو فریقین کو نکاح ثانی کی اجازت دے دی ہے۔

لیکن لیمبتھ کانفرنس صرف انگریزی کلیسیا کے بشپوں کی رائے کا اظہار ہے۔ نہ کہ تمام کلیسیا کی اور ملکی قانون محض ایک رسول (Civil) قانون ہے۔ جو لیمبتھ کانفرنس سے ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور چونکہ بیاہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ہماری مذہبی زندگی کی جان ہے۔ لہٰذا مسیحی لوگوں سے یہ توقع کرنا کہ وُہ اِس قانون کو قبول کریں اور اسے سند جان کر کلیسیا کے قدیمی دستور کو ردّ کر دیں قرینِ عقل معلوم نہیں ہوتا۔

اگر یہ مان لیا جائے (۱) کہ مسیح نے طلاق بوجہ زِنا کے بعد فریق

معصوم کو نکاح ثانی کی ممانعت[1] نہیں کی ہے (۲) کہ انگلستان کی کلیسیا کا غیر تبدیل شدہ قانون اس کی ممانعت کرتا ہے۔ اندریں حالات اس کلیسیائی قانون کو تبدیل کرنا چنداں مفید ثابت نہ ہوگا۔ بلکہ مناسب ہے کہ ہم کلیسیا کے اس قانون کو قائم رکھیں۔ اور کلیسیائی رسوم کے ماتحت اس قسم کے نکاح ثانی کی اجازت نہ دیں اور لیمبتھ کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق پاک عشاء کی شراکت کا معاملہ بشپوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔

ممکن ہے کہ گرجا گھروں میں نکاح ثانی کی ممانعت اور سرکاری قوانین میں عدم مطابقت اور کچھ عرصہ تک اختلاف لائے رہے لیکن امید کی جاسکتی ہے کہ کچھ مدت کے بعد ہمارے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی تسلی بخش سمجھوتہ عمل میں آجائے۔ لیکن یہ مشکل اس قدر گراں قدر نہیں ہے۔ جتنی وہ مشکل تھی جو عبادتِ عام کے قانون کے متعلق تھوڑے سے استقلال کے ذریعہ دور ہوئی۔ اگر اس مباحثہ کے دوران میں انگلستان کے ملک میں سول میرج (CIVIL MARRIAGE) قانوناً لازمی قرار دی جائے اور دیگر بدیشی ممالک کی طرح اس کی تشہیر کی جائے اور بعد میں مذہبی رسومات کے عمل میں لانے کی اجازت ہو تو بہت سے شرکائے کلیسیا اسے ترقی کا ایک پہلا قدم سمجھیں گے۔ بعض اوقات طلاق

---

[1] اس سے کچھ زیادہ کہنا شاید مناسب نہیں ہے۔ مسیح ایک خاص حالت کو ایک عام امتناع کے دائرے میں سے نکال کر اس سے مستثنا ٹھہراتا ہے اور کلیسیا کو اس امر میں آزادی دیتا ہے۔

بوجہ زِنا کے بعد نکاحِ ثانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اِسکی اجازت ہمارے خُداوند کی طرف سے صرف معصُوم خاوند کے لئے ہے۔ لیکن میرے خیال میں کلیسیا کو اختیار ہے کہ وہ اِس حق کو بیوی کے لئے بھی جائز قرار دے۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر فریقِ معصُوم کو نکاح ثانی کی اجازت دِی جاتی ہے تو فریق مجرم کو بھی اجازت ملنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر زِنا کی وجہ سے بیاہ کا رِشتہ ایک کے لئے ٹُوٹ جاتا ہے۔ تو دُوسرے کے لئے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا جواب یُوں دیا جا سکتا ہے کہ ہمارا خُداوند اس جگہ ایک قانُون مقرر کر رہا ہے نہ کہ کوئی عام اصُول۔ اور اُس کا قانون صرف ایک فریق سے تعلّق رکھتا ہے نہ کہ دونو سے۔ وہ فریق معصُوم کو ایک رعایت دیتا ہے جو فریق مجرم کو نہیں دی جاتی۔

---

PDF by: Matthew Sinclear
→ Theological Research
centre, Vehari.

Scanned with CamScanner

91-
45
56

Printed at the Talimi Printing Press,
by [illegible]. V. S. K. Faz[illegible],
Secretary, Punjab Religious Book Society,
Anarkali - Lahore.